پاکستان اور مسلمان

از

انیس الرحمن

ملنے کا پتہ:- مولانا محمد الفاروق - نمبر ۳۹ ساؤتھ ملاکا - الہ آباد

Pākistān aur Musalmān

al-Raḥmān, Anīs.

تحریکِ پاکستان کا پسِ منظر

"تقسیم کرو اور حکومت کرو" (DIVIDE AND RULE) مدبّرین برطانیہ کا
بہت ہی پرانا اصول ہے، اور اس کا جلوہ آج ہمیں تقسیم ہند کی 'تحریکِ پاکستان'
میں پوری طرح نظر آرہا ہے۔ تحریکِ پاکستان کا مطالعہ کرنے کے لئے ہمیں گذشتہ
صدی کی برطانی پالیسی پہ ایک نظر ڈالنی چاہئے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں برطانی حکومت کو جس طرح ہندوستان کی متحدہ
طاقت سے ٹکر لینی پڑی تھی، یہ سبق ایسا نہ تھا کہ انگریز مدبّرین اِسے فراموش کر دیتے
چنانچہ اسی وقت سے سیاستِ برطانیہ کی تمام طاقتیں نہایت فاضلانہ طور پہ اِس مقصد
کے لئے صرف ہونے لگیں کہ کسی طرح ہندوستان کی اِن دو بڑی ملّتوں کے دل سے
'ہندی قومیّت' اور احساس اتحاد و یکجہتی کو محو کر دیا جائے۔ انگریزوں نے یہ دیکھ لیا
تھا کہ غیر ملکی اقتدار سے آزادی کی جدّوجہد میں کس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں نے
ایک ہو کر مورچے لئے، اور 'ہندو راج' یا 'مسلم راج' کا سوال اُٹھائے بغیر
دہلی جا کر انھوں نے بہادر شاہ ظفر کو اپنا سردار بنا لیا۔ اُس وقت نہ ہندوؤں
کو مسلم راج کا ڈر پیدا ہوا اور نہ مسلمانوں کو ہندو اکثریت کا، بس صرف ایک خطرہ
اُن کے سامنے تھا اور وہ فرنگی راج کا۔ انگریزوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ۱۸۵۷ء
کا غدر کوئی اچانک خلفشار نہ تھا' جو کارتوسوں کی چربی کے سبب یک بہ یک پھوٹ
پڑا، بلکہ یہ ہندو اور مسلمان رہنماؤں اور سرداروں کی متحدہ اسکیم تھی، جو نہایت
غور و فکر سے مرتب کی گئی تھی، اور اس میں عظیم اللہ خاں، بیگم حضرت محل، شہزادہ
فیروز شاہ، خان بہادر خاں اور مولوی احمد اللہ فیض آبادی جیسے مسلم زعما اُسی
طرح شریک تھے جس طرح نانا صاحب، جھانسی کی رانی، تانتیا توپی، اور راجہ
کنور سنگھ تھے۔

پھوٹ کا بیج

ظاہر ہے کہ اس احساسِ وطنیت اور قومیت سے انگریزی اقتدار کو بہت بڑا دھکا لگا تھا۔ چنانچہ اس خطرہ کو مدبرین برطانیہ نے بروقت محسوس کیا اور اس کے بعد انگریزوں کی تمام کوششیں اس کام میں صرف ہونے لگیں کہ ہندستانیوں کے دلوں سے بالواسطہ اور بلا واسطہ ہر طرح سے اِس اتحاد و یگانگت کو مٹا دیا جائے، اور رفتہ رفتہ ان میں اِس طرح پھوٹ کا بیج بو دیا جائے کہ وہ بالآخر یہ سمجھنے لگیں کہ وہ ایک نہیں بلکہ دو قوم ہیں اور اُن کے مفاد بالکل جُدا جُدا اور متضاد ہیں۔ اُسی زمانہ کا ایک مصنّف پروفیسر سیلے ایکنپشن آف انگلینڈ EXPANSION. OF ENGLAND میں لکھتا ہے:۔

> اگر ہندوستان میں متحدہ قومیت کا کمزور جذبہ بھی پیدا ہو جائے اور اس میں اجنبیوں کے نکالنے کی کوئی روح نہ بھی ہو، بلکہ صرف اس قدر احساس عام ہو جائے کہ اجنبی حکومت سے اتحادِ عمل ہندستانیوں کیلئے شرمناک ہے تو اُسی وقت ہماری شہنشاہیت کا خاتمہ ہو جائیگا کیونکہ ہم درحقیقت ہندوستان کے فاتح نہیں ہیں اور اِس پر فاتحانہ حکمرانی نہیں کرسکتے۔ اگر ہم اس طرح کی حکومت کرنی بھی چاہیں گے تو اقتصادی طور پر برباد ہو جائیں گے۔

لیکن سوال یہ تھا کہ اس اتحاد و اتفاق کے جذبہ کا استیصال کیونکر کیا جائے۔ انگریز قوم دور اندیشی اور عاقبت بینی میں مشہور ہے۔ وہ کبھی کچّا کام نہیں کرتی۔ اُس نے دیکھا کہ وقتی طور پر انھیں لڑانے بھڑانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، وہ پھر کسی نہ کسی نازک موقع پر مل جائیں گے۔ اِس لئے ضرورت ہے کہ اُن کے مابین ایک ایسی مستقل خلیج حائل کردی جائے، جو پاٹی نہ جاسکے۔

اور جس کا اثر نسلاً بعد نسلاً پہنچتا رہے۔ چنانچہ انگریز مصنفین کا ایک گروہ پیدا ہو گیا جس نے اس مقصد کو سامنے رکھ کر ہندوستان کی تاریخیں لکھنی شروع کیں۔ ایلیٹ، کیمبرن، لین پول وغیرہ مورخین نے اس خدمت کو بڑی خوبی سے انجام دیا۔ ان تاریخوں کا لب لباب یہ تھا کہ "اورنگ زیب" ظالم تھا اور سیواجی ایک لٹیرا۔ سب سے زیادہ کوشش یہ زہر پھیلانے کی نئی نسلوں پر کی گئی، اور اسکولوں کے لئے اسی ڈھانچے پر تاریخیں لکھی اور پڑھائی جانے لگیں۔ اس کا ہندوستانیوں پر کیا اثر مرتب ہوا، یہ ایک انگریز ہی کی زبانی سنئے، سر جان مینارڈ (SIR JOHN MENARD) لکھتے ہیں۔

> ہندوستان میں خانہ جنگی کی طرف رجحان موجود ہے، جس کا نمونہ ہندو مسلم عناد ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر یہ رجحان نہ ہوتا تو ہماری حکومت قائم نہ ہو سکتی اور نہ برقرار رہ سکتی تھی، یہ بھی صحیح ہے کہ ہندو مسلمانوں میں عام مخالفت برطانیہ کے عہد میں شروع ہوئی۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی ظالم بادشاہ گذرے ہیں۔ جنہوں نے غیر مسلموں پر جزیہ لگایا اور کسی نے مجنونانہ جوش میں آکر ذبیحہ گاؤ پر سزائیں دیں لیکن یہ واقعات گاہے ماہے پیش آتے تھے شجر علم (نئی تاریخ) کا پھل چکھنے سے پہلے عوام میں اس مذہبی افتراق کا احساس نہ تھا۔ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان دونوں ایک ہی عبادت خانے میں پرستش کرتے نظر آتے تھے۔

اِن تاریخوں میں کس طرح ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا جاتا تھا اس کا ایک نمونہ حسب ذیل ہے۔ سر ہنری ایلیٹ (SIR HENRY ELLIOT.) جو کمپنی کی حکومت کے محکمۂ خارجہ کے سکریٹری تھے اپنی "تاریخ (ہندوستان)" میں لکھتے ہیں:۔

ہندو مصنفین پر مجھے بڑا افسوس ہوتا ہے ان لوگوں سے ہمیں یہ توقع تھی کہ وہ ہمیں اپنی قوم کے احساسات، و توقعات اور معتقدات بتائیں گے لیکن وہ ابتک (شاہی) احکام و ہدایات کے مطابق لکھتے ہیں۔ محرّم کے مہینے کو "محرّم شریف" اور قرآن کو 'کلام پاک' کہتے ہیں' اور اپنی تحریروں کو "بسم اللہ" سے شروع کرتے ہیں۔

سر ہنری پھر ہندوؤں کو اس طرح سنہ دیتے ہیں:۔

اب جبکہ ہندو اپنے ظالم (مسلمان) آقاؤں کے چنگل سے آزاد ہو گئے ہیں اور بے روک ٹوک اپنے دل کی باتیں ظاہر کر سکتے ہیں، تب بھی ان غلامانہ ذہنیت کے لوگوں میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں پیدا ہوا جو اپنے ملک کے صحیح احساسات کو قلمبند کر سکے طویل زمانہ مظلومیت کی کیفیات اور جذبات کا اظہار کر سکے

"مظلومیت کی کیفیات اور جذبات" کا فقرہ خاص طور پر محلِ نظر ہے۔

مسلمانوں کے متعلق یہ مورّخین کن خیالات کا اظہار کرتے تھے اُن کا بھی ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔ (سر سیّد نے تہذیب الاخلاق میں ایک انگریز کی یہ تحریر نقل کی ہے، لیکن نام ظاہر نہیں کیا ہے)

ہندوستان کے مسلمان ایک نیچے درجہ کی اُمّتِ محمّد سے ہیں اور قرآن کے اُصولوں اور ہندوستان کی بُت پرستی سے مل ملا کر اُن کا مذہب ایک عجیب مجموعہ بن گیا ہے۔

زبان کا جھگڑا

اتنا ہی نہیں۔۔۔ ہندو مسلمانوں میں بُنیادی تفریق ڈالنے کیلئے انگریزوں نے ایک اور اہم خدمت، انجام دی۔ یعنی ہندی

اور اردو کا جھگڑا کھڑا کر دیا۔ ہندستان کی ایک زبان، زمانہ ہوا، بن چکی تھی اور اُس زمانہ میں اسی ایک زبان میں تمام تصنیفیں ہوا کرتی تھیں، یہ زبان 'اردو' اور ہندی' دونوں ہی ناموں سے پکاری جاتی تھی۔ ۱۸۰۰ء میں کلکتے میں 'فورٹ ولیم کالج' قائم ہوا۔ انگریز پروفیسروں کی نگرانی میں بہت سی قابل قدر کتابیں جیسے 'میر امّن کی باغ و بہار'، شیر علی افسوس کی 'آرایشِ محفل'، حیدری کا طوطی نامہ'، مرزا طپش 'کی بہار دانش'، وغیرہ لکھی گئیں، سب سے پہلے انگریزوں نے اس کا نام ہندوستانی رکھا۔ لیکن بعد کو انگریز مفکروں کی نگاہ میں ہندو اور مسلمانوں کا اُشتراک زبان' کھٹکا اور اُنھوں نے سوچا کہ کہیں یہ متحدہ قومیت کو مضبوط کرنے میں مددگار نہ ہو، چنانچہ اِسی فورٹ ولیم میں ایک دوسری زبان کی بنُیاد ڈالی گئی۔ اس کام کے لئے سب سے پہلے للوجی لال کو منتخب کیا گیا۔ جنھوں نے اُردو عبارت سے فارسی وعربی کے الفاظ خارج کرکے سنسکرت کے الفاظ رکھدیئے۔ اور اس طرح موجودہ' جدید ہندی' کی بُنیاد ڈالی اور انگریزوں نے اسے ہندؤں کی زبان قرار دیا۔

واضح رہے کہ اس سے پہلے 'ہندی' کوئی علیحدہ زبان نہ تھی بلکہ ایک ہی زبان کیلئے اردو' ہندی'، اور ریختہ' تینوں نام استعمال کیے جاتے تھے۔ میر امّن نے اپنی تصنیف "قصّہ چہار درویش" کو ایک عرضی کے ساتھ پیش کیا جس میں وہ لکھتے ہیں "اُردوئے معلّیٰ کی زبان میں باغ و بہار بنایا"۔ اس عرضی کے آخر میں یہ شعر ہے ؎

سو اُردو سے آراستہ کر زباں کیا میں نے بنگالہ ہندوستاں

بابو کاشی ناتھ بسواس (کرانی کمپنی) اپنی کتاب "قصّہ سوسن مسمیٰ بہ گلدستۂ انجمن" میں لکھتے ہیں۔ "انگریزی زبان سے اردو میں ترجمہ کیا" لیکن مرزا طپش نے اپنی کتاب شمس البیان میں 'ہندی' کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔ "ہندی عبارت از زبان موزونِ دہلی است" پھر آپ ایک ہی شعر میں اِس زبان کو ہندی اور اردو دونوں کہتے ہیں ؎

شہرت اس نے ہندی زبان کو دیا نظم اردو کو یہ مرتبہ

چند اشعار کے بعد اِسے ریختہ کہتے ہیں ۔ وقائع میں ہے ریختے کے تمام ۔غرضیکہ اُس زمانے میں، اس زبان کو اردو، ہندی اور ریختہ تینوں ناموں سے پکارا جاتا تھا۔

غرضیکہ اس طرح ساحرین فرنگ نے اُس جھگڑے کی بُنیاد ڈالی، جو آج اُردو، ہندی، یا ہندی ہندستانی اور اردو ہندستانی کی شکل میں چل رہا ہے۔ لیکن ابھی ایک اہم کام باقی تھا یعنی ہندو اور مسلمانوں کو دو سیاسی کیمپوں میں تقسیم کر دینا۔ یہ مقصدِ جلیلہ کس طرح بروئے کار آیا یہ ذیل کے واقعات سے معلوم ہوگا۔

انگریز اور مسلمانوں کی متحدہ انجمن

۱۸۵۷ء کی بغاوت سے انگریز مدبرین نے یہ نتیجہ مرتب کیا کہ ہندستانیوں کو ملکی نظم و نسق سے الگ رکھنا حماقت ہے، نظام ملکی سے ہندستانیوں کو خارج رکھنے سے اُنھیں شبہات اور غلط فہمیاں پیدا ہوئیں جس کا مظہر یہ غدر تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریہ کا وہ مشہور اعلان ہوا اس کے بعد ۱۸۶۱ء ہندستان کو آئینی اصلاحات کی پہلی قسط ملی، جس کی رو سے گورنر جنرل کی کانسل میں ایک ہندستانی کی نامزدگی ہونے لگی، لارڈ رپن نے اپنے عہد حکومت میں شہری آزادی سے متعلق چند قوانین پاس کیے جن کی رو سے ہندستانیوں کو حکومت پر نکتہ چینیاں کرنے کی تھوڑی سی آزادی دی گئی اور پریس پر جو گرفت تھی وہ بھی کچھ ڈھیلی ہوئی۔ اس طرح اصلاحات کی اُس دوسری قسط کے لئے میدان تیار ہونے لگا، جو ۱۸۹۲ء میں آنیوالی تھی [illegible] ملک کے اکثر صوبوں میں سیاسی جماعتیں قائم ہونے لگیں اور ان میں ہندستانیوں کے سیاسی حقوق کی بحث چھڑ گئی۔ سب سے پہلی سیاسی انجمن ۱۸۵۱ء میں "برٹش انڈین ایسوسی ایشن" کے نام سے بنگال میں قائم ہوئی۔ پھر بمبئی میں "بمبئی ایسوسی ایشن" قائم ہوئی جس کے بانیوں میں دادا بھائی نوروجی بھی تھے۔ اس کے بعد مہاراشٹر میں 'سروجانک سبھا' پھر مدراس میں، 'مہاجن سبھا' قائم ہوئی۔ پریس اور پلیٹ فارم کی جو تھوڑی سی آزادی ملی اُس سے بنگال کی انڈین ایسوسی ایشن نے پورا پورا فائدہ

اٹھایا اور اس کے روح رواں سر سریندر ناتھ بنرجی نے دورہ کر کے ہندوستانیوں
کو بیدار کرنا شروع کیا لیکن بالآخر انگریز حاکموں نے سوچا کہ اس طرح صوبہ وار طریقے پر جو جماعتیں
قائم ہو رہی ہیں، وہ ہندوستانیوں کو غلط راستہ پر لے جا سکتی ہیں۔ اور وہ کس وقت
کیسا رویہ اختیار کریں یہ بھی ٹھیک نہیں۔ لہٰذا ہندوستان کے اس ابھرتے ہوئے جذبۂ
آزادی پر قابو رکھنے اور اسے ٹھیک ٹھیک سامراجی مفاد کی شاہراہ پر چلانے کیلئے
ایک آل انڈیا سیاسی انجمن کے قیام کی ضرورت ہے

ایک آل انڈیا سیاسی انجمن کے قیام کا سہرا ایک انگریز مدبر مسٹر اے۔ او۔
ہیوم (Mr. A. O. HUME) کے سر ہے۔ جو انڈین
سول سروس کے ایک رکن تھے، اور پنشن لینے کے بعد بھی ہندوستان ہی میں
اڈٹے ہوئے تھے۔ مسٹر ہیوم نے لارڈ ڈفرن سے مشورہ کیا اور بڑے بڑے
ہندوستانیوں کے سامنے یہ خیال پیش کیا اور ان کی تائید سے ۱۸۸۵ء میں آل
انڈیا یونین (یعنی انڈین نیشنل کانگریس) بمبئی میں قائم کی گئی۔ اس انجمن کا مقصد
لارڈ ڈفرن (اس وقت کے وائسرائے) کے الفاظ میں یہ تھا۔

> اس ملک میں ایسے لوگوں کی کوئی جماعت نہیں ہے جو
> مثل انگلستان کے ملک معظم کی حکومت کی حزب مخالف
> (OPPOSITION PARTY) کا کام کرے۔ انگریزوں کو
> چونکہ یہ علم نہیں ہوتا کہ ہندوستانیوں میں ان کی نسبت
> اور ان کی پالیسی کی نسبت کیا خیالات ہیں، اس لئے حاکم
> اور محکوم دونوں کیلئے یہ مفید معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان
> کے سیاست داں اصحاب سالانہ جمع ہو کر گورنمنٹ کو یہ
> بتلائیں کہ اس کا انتظام کن کن امور میں ناقص ہے اور اسکو
> کس طرح بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

ہندوستان میں سیاسی جماعتیں قائم کرنے کا ٹھیکہ تو انگریزوں نے لے لیا۔

لیکن وہ اس کے مستقبل پر باندہ نہیں لگا سکتے۔ مسٹر ہیوم اور لارڈ ڈفرن نے جس عاقبت اندیشانہ پالیسی کے ماتحت ہندستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک مرکزی سیاسی جماعت بنانے میں مدد دی تھی، وہ جب ایک ہندستانی بانیوں کے سامنے نہ تھی یہ لوگ کوئی اپوزیشن پارٹی بنانے کیلئے نہیں جمع ہوئے تھے بلکہ ایک خالص سیاسی مرکزی قومی ادارہ بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان لوگوں نے آگے چل کر اس کا نام آل انڈیا یونین کے بجائے انڈین نیشنل کانگرس (ہندستان کی قومی مجلس) رکھا۔ اس نے پہلے ہی اجلاس میں "متحدہ قومیت کی تعمیر" کی جو تجویز پاس کی اُس پر خلاف توقع ملک نے زوروں پر لبیک کہا۔ چند برسوں کے بعد کانگرس نے کانسلوں میں نان آفیشل ممبروں کی تعداد میں اضافے، انڈین سول سروس کا امتحان ہندستان میں ہونے، کثیر فوجی اخراجات میں تخفیف کرنے، فوج میں ہندستانی سپاہیوں کی تعداد بڑھانے، عدالت اکزیکیٹو علیٰحدہ علیٰحدہ کرنے وغیرہ کے مطالبات شروع کر دیئے۔ یہ دیکھ کر سول سروس کے اکثر اصحاب کے کان کھڑے ہوئے۔ ان میں سے بڑے بڑے انگریز مسٹر بیک، مسٹر ماریسن، اور سر آکلینڈ کالون نے اس جماعت کی طاقت کمزور کرنے اور خاص کر مسلمانوں کو اس سے علیٰحدہ رکھنے میں انتہائی ذاتی مساعی شروع کر دیں۔ چند مولویوں کے دستخط سے ایک فتویٰ شائع ہوا جس میں کانگرس کی شرکت ناجائز قرار دیگئی۔ لیکن ہندستان کے اکثر علماء ابتدا سے انگریزی اقتدار کے مخالف تھے اور شروع سے انکی یہ رائے تھی کہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے اشتراکِ عمل کر کے ملک کو اغیار کی غلامی سے نجات دلانا چاہیئے۔ چنانچہ ان بزرگوں نے سر سید کی مغربی تعلیم کی تحریک کی بھی اسی لئے مخالفت کی کہ سر سید کے رجحانات بالکل انگریز پرستی کی طرف مائل تھے اور اس سے انھیں خطرہ پیدا ہو گیا کہ شاید وہ آنیوالی مسلمان نسل کو انگریزوں کی دائمی غلامی میں سونپنا چاہتے ہیں بہرحال اس فتوے کے خلاف کانگرس کی شرکت کے جواز میں ہندستان کے تقریباً کل نامی گرامی علماء کے دستخطوں سے "نصرۃ الابرار" کے نام سے ایک رسالہ شائع ہوا۔

جس میں یہ بتلایا گیا کہ دنیوی اور ملکی معاملات میں ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنے میں انھیں اسلام نہیں روکتا۔ لیکن علی گڈھ اسکول کے سیاسئین اس کے بالکل خلاف رہے۔ انھیں سر آکلینڈ کالون کی سرپرستی مل گئی۔ صاحب بہادر سفر کر کے علی گڈھ گئے اور اپنے اثر سے انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن INDIAN PATRIOTIC ASSOCIATION قائم کرائی یہ جماعت اسی مقصد کیلئے بنائی گئی تھی جس مقصد کے لئے تحریک سول نافرمانی کے زمانہ میں ضلع کے مجسٹریٹ اور کلکٹر امن سبھائیں قائم کراتے پھرتے تھے اِس جماعت نے کھلم کھلا کانگرس کی مخالفت شروع کر دی۔ اس انجمن کو ایک قابل انگریز 'مددگار' بھی مل گئے۔ جن کا نام مسٹر تھیوڈور بیک تھا' اور جو علی گڈھ کے نامی و گرامی پرنسپل گذرے ہیں؛ پھر ۱۸۹۳ء میں ایک خالص 'مسلم' انجمن کی بنیاد ڈالی گئی جو محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس انجمن کے مقاصد حسب ذیل قرار پائے:۔

(الف) مسلمانوں کی رائے انگریزوں اور گورنمنٹ ہند کے سامنے پیش کر کے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کرنا۔

(ب) عام سیاسی شورش کو مسلمانوں میں پھیلنے سے روکنا۔

(ج) ان تدابیر میں مدد دینا جو سلطنت برطانیہ کے استحکام اور سلطنت کی حفاظت میں ممد ہوں۔ ہندستان میں امن قائم رکھنے کی کوشش کرنا اور لوگوں میں وفاداری کے جذبات پیدا کرنا۔

غرضیکہ اِس جماعت کا مقصد مسلمانوں کی حفاظت سے زیادہ انگریزی سلطنت کی خدمت تھا' نام سے ظاہر ہے اینگلو اورینٹل ڈیفنس۔ کیوں نہ ہو۔ انگریزوں اور مسلمانوں کے مفاد تو بالکل ایک جیسے تھے اس لئے دونوں کو ملا کر ایک متحدہ انجمن بنانے کی ضرورت تھی۔ کانگرس نے اپنے اوّل اجلاس ہی میں پہلا مقصد ہندستان میں ایک متحدہ قومیت کی تعمیر رکھا تھا اگر یہ 'شورشی' تخیل مسلمانوں کے دماغ میں بھی سما جاتا تو پھر سلطنتِ برطانیہ کا 'استحکام' کس

طرح ہوتا۔

جداگانی ذہنیت کی ابتدا

مسلمانوں کو ہندستان کی تمام سیاسی جدوجہد سے الگ رکھنے کیلئے انگریز حکام نے یہ سب تو کیا لیکن ابھی وہ چیز باقی تھی جو برٹش سامراج کا سب سے بڑا ڈپلومیٹک کارنامہ ہے اور ہندستان کی سیاسی تاریخ کا سب سے بڑا حادثہ ۔ یعنی جداگانہ انتخاب۔
۱۸۹۲ء میں آئینی اصلاحات کی دوسری قسط ملی۔ اس میں انتخاب مخلوط رکھا گیا تھا۔ لیکن بغیر یہ تجربہ کئے ہوئے کہ مخلوط انتخاب مفید ہے یا مُضر مسلمانوں میں اس کے خلاف شورش پھیلائی جانے لگی۔ مسلمانوں کی 'نئی سیاسی جماعت' 'اینگلو اورنٹیل مسلم ڈیفنس' کی طرف سے ایک عرضداشت مرتب کی گئی جس پر سرسید کے فرزند بلند اقبال جسٹس سیّد محمود نے بیس ہزار مسلمانوں کے دستخط کرا کے انگلستان بھیجا۔ اس عرضداشت کا لب لباب یہ تھا کہ

اس مُلک کیلئے جمہوری طریقہ حکومت درست نہیں کیونکہ یہاں
مختلف فرقے کے لوگ بستے ہیں اور مسلمانوں کا مطالبہ ہے
کہ مخلوط انتخاب کی جگہ فرقہ وارانہ انتخاب رائج کیا جائے۔

غرضیکہ اِس وقت سے مسلمانوں میں جداگانہ انتخاب کا پروپگنڈا شروع ہو گیا۔ چند سال بعد لارڈ مارلے وزیر ہند اور لارڈ منٹو وائسرائے مقرر ہوئے۔ لارڈ کرزن کے وقت میں ہندستان کی فضا جس قدر "شورش انگیز" ہو گئی تھی اُسے لارڈ منٹو نے درست کرنا چاہا۔ انھوں نے ایک کمیٹی بنائی تاکہ وہ ہندستان میں دورہ کر کے سیاسی حالات کا جائزہ لے اور اپنی رپورٹ پیش کرے۔ نواب محسن الملک، وقار الملک اور اور آغا خاں جیسے بزرگوں نے ۱۹۰۶ء میں ایک وفد مرتب کیا اور لارڈ منٹو کو ایک سپاسنامہ پیش کیا۔ اس سپاسنامے میں ان بزرگوں نے صاف طور پر مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا تھا۔ لیکن اُس وقت بھی روشن خیال مسلمانوں کا ایک بہت بڑا گروہ "مسٹر حسن امام،

مولانا مظہر الحق وغیرہ) مخلوط انتخاب کا حامی تھا اور وہ اپنے بھائیوں کو اس غلط اقدام سے روکنا چاہتا تھا لیکن انھوں نے نہ مانا لارڈ مارلے نے مسلمانوں کے لئے جداگانہ طرزِ نیابت کو منظور کر لیا اور اسی وقت سے ہندوستان میں مسلمانوں کی جداگانہ مسلم سیاست کی تعمیر شروع ہوئی اور ہندستانی بیّن طور پر دو سیاسی کیمپ میں منقسم ہو گئے۔

لارڈ منٹو سے جو مسلمان جداگانہ حقِ نیابت منوانے گئے سلسلے میں مل جل رہے تھے انھوں نے مسلمانوں کے لئے ایک جدید سیاسی انجمن کی ضرورت محسوس کی تاکہ مسلمانوں میں اس 'جداگانی' ذہنیت کا بخوبی پروپگنڈا کیا جا سکے۔ چنانچہ ۱۹۰۶ء ڈھاکہ میں نواب صاحب ڈھاکہ کے محل میں 'آل انڈیا مسلم لیگ' کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اس طرح فرقہ وارپروپگنڈے کے لئے ایک باقاعدہ محاذ تیار ہو گیا۔ اس کے کرتا دھرتا اوائلِ تحریک سے وہی مسلمان رہے جو حکومت کے مقبول تھے۔

جداگانہ انتخاب سے جداگانہ ہندستان

گذشتہ تیس برسوں سے ہندستان میں 'ہندو انتخاب' اور 'مسلم انتخاب' رائج ہے۔ تیس برسوں کی مدّت کچھ تھوڑی نہیں ہوتی۔ جو قوم تیس برسوں سے اپنے برادرانِ وطن سے سیاسی طور پر الگ رہی ہو، وہ لازمی طور پر اپنے کو ایک علیحدہ قوم تصوّر کرنے لگیگی۔ ہندو مسلمانوں کو دو جدا جدا سیاسی کیمپ میں تقسیم کرنا آخر رنگ لا کے رہا، جو لوگ کل جداگانہ انتخاب کے نعرے لگا رہے تھے آج وہ ایک قدم آگے بڑھ کر جداگانہ ہندستان کے نعرے لگا رہے ہیں۔

لیکن تجویزِ پاکستان کے بعد ایک چیز مسلّم ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ جداگانہ انتخاب مسلمانوں کی محافظت نہ کر سکا۔ مسلمانانِ ہند کی محافظت کے لئے عرصہ تک ہندستان میں مختلف تدابیر پر غور کیا جاتا رہا ہے آخر بڑے غور و فکر اور بڑے بڑے زعماء و قائدینِ ملّت کے سر جوڑ کر سوچنے بچارنے کے بعد یہ رائے ٹھہری

کہ مسلمانوں کے استحفاظ کیلئے جُداگانہ انتخاب ضروری ہے۔ بغیر اس کے مسلمان زندہ نہیں رہ سکتے۔ ان کا کلچر، تمدّن، مذہب سب مٹ جائیگا۔ اس کے بعد جُداگانہ انتخاب کے ساتھ ویٹیج (WEIGHTAGE) بھی شامل کیا گیا۔ لیکن قوم پرور اور روشن خیال مسلمانوں کا ایک طبقہ تھا جو ہمیشہ اس کے خلاف رہا وہ اپنے تدبّر اور دوربین نگاہوں سے دیکھ رہا تھا کہ یہ بالکل غلط چیز ہے۔ اس سے مسلمانوں کی محافظت نہیں ہو سکتی لیکن فرقہ پرور طبقہ نہ مانا۔ آخر ۱۹۱۶ء میں کانگرس نے بھی مسلمانوں کی یہ ہٹ منظور کر لی اور لکھنؤ میں معاہدہ ہو گیا۔

پھر گول میز کانفرنس کے وقت ایک موقع آیا کہ مسلمان اپنے تجربے سے فائدہ اُٹھاتے اور غلطی محسوس کرتے لیکن وہ اسی پر اڑے رہے۔ ۱۰ اپریل ۱۹۳۱ء کو سارے ہندستان میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کی طرف سے "یوم جُداگانہ انتخاب" منایا گیا۔ اُسی طرح جس طرح ۱۹ اپریل ۱۹۴۱ء کو "پاکستان ڈے" منایا گیا تھا۔ بالآخر انھوں نے کمیونل اداروں میں جُداگانہ انتخاب رکھوا ہی چھوڑا۔ لیکن آج وہ جُداگانہ انتخاب کہاں ہے، جو اسلام کی حفاظت کیلئے اس قدر ضروری سمجھا گیا تھا۔ آج تو ایک دوسرا نعرہ ہے ۔۔ پاکستان۔ تحریک پاکستان کا مطلب یہی ہے کہ فرقہ پرور لیڈروں نے تیس سال کے تجربہ کے بعد یہ تسلیم کر لیا کہ جُداگانہ انتخاب اور ویٹیج ایک غلط چیز ہے اور اس سے مسلمانوں کی محافظت نہ ہو سکی۔ آج دوربین قوم پرور مسلمانوں کی بات سچّی ثابت ہوئی۔

لیکن ایک غلطی کے ارتکاب کے بعد اسے نباہنے کیلئے چند اور غلطیاں بھی کرنی پڑتی ہیں۔ جُداگانہ انتخاب ناکامیاب ہو گیا۔ تیس سال تک مسلم رہبرانِ ملّت غلط روش پر چلے مسلمانوں کو پیچھے رکھا، جھک مارا۔ یہ اب بالکل حقیقت ہے۔ لیکن یہ فرقہ پرور رہنمایان اپنے عمل کا جائزہ نہ لیں گے۔ اپنی غلطی محسوس نہ کریں گے۔ اور اس غلطی کا کفارہ ادا نہ کریں گے بلکہ وہ ایک غلطی اور کریں گے ۔ یعنی پاکستان بنائیں گے۔

پاکستان کی بنیاد

مصنفِ اسکیم اور مسٹر جناح کے بنیادی نظریے

سب سے پہلے ہمیں یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ "تقسیم ہند" کی اسکیم کی بنیاد کیا ہے اور وہ کون سا اصول یا نظریہ ہے جو اس اسکیم کا محرک ہوا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم مصنفین اسکیم کے بنیادی نظریے کو، اپنے الفاظ میں پیش کرنے کے بجائے خود ان کے حوالے سے پیش کریں تاکہ اخذ نتیجہ میں کسی طرح کے شبہے کی گنجائش نہ ہو۔ تقسیم ہند کی جتنی اسکیمیں ہمارے سامنے آئی ہیں اُن میں "پنجابی" کی اسکیم، جو "کانفڈریسی آف انڈیا" (CONFEDERACY OF INDIA) (شائع کردہ نواب سر محمد شاہ نواز خاں آف ممدوٹ) نامی کتاب میں پیش کی گئی ہے، دوسری اسکیموں سے نسبتاً زیادہ مقبولیت حاصل کر سکی ہے۔ اِس لئے سب سے پہلے ہم اِسی سے حوالے پیش کریں گے :-

"ہندستان میں ایک متحدہ قومیت کی تعمیر کی جو کوشش ہو رہی ہیں ان کی بنیاد یہ غلط مفروضہ ہے کہ ہندستان ایک واحد ملک ہے اور ہندستانی ایک واحد قوم"

(کانفڈریسی آف انڈیا۔ مصنفہ "پنجابی" صفحہ ۵۶)

"کامن مدرلینڈ" کے عنوان کے تحت صفحہ [illegible] پر لکھتے ہیں۔

"اگر ان دونوں فرقوں کے درمیان کوئی چیز مشترک ہے تو وہ ہندستان ہے، جسے غلطی سے ایک ملک فرض کر لیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ ایک چھوٹا برِّ اعظم ہے، جس میں کئی ممالک ہیں۔"

شمالی مغربی صوبوں کی علٰحدگی کے طویل وجوہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"پچھلی بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان قطعاً دو علیحٰدہ علیحدہ وجود ہیں۔ ان کی تہذیب و تمدن بیّن طور پر جداگانہ تشخیص کا حامل ہے اور اگرچہ وہ ماضی میں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوئے ہوں، لیکن وہ کسی طرح ایک دوسرے میں مدغم ہو جانا برداشت نہیں کر سکتے۔ عادات و اطوار، رسوم، طرز معاشرت، اخلاق، اور پھر مذہبی، ثقافتی (کلچرل)، اور سیاسی نظریات، روایات، زبان، ادب، آرٹ طرز تعمیر اور تصوّرات زندگی نہ صرف ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں۔ بلکہ متضاد ہیں.........

....

اِن فرقوں کے مابین یہ بنیادی تفرقے۔ ماضی و حال کے مناقشوں کی یاد، اور شکایات اور مظالم کے وہ دفتر جو دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف گذشتہ ایک ہزار سال میں جمع کئے ہیں، یہ کل چیزیں ان کے مابین ایک ایسی خلیج حائل کر دیتی ہیں جس کا پاٹنا محال ہے۔ ان دونوں کے درمیان گذشتہ صدیوں میں جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں اگر کوئی چیز متحّد رہی ہے تو وہ ایک غیر ملکی حکومت کا جُوا ہے۔" (صفحہ ۱۵۰ اور ۱۵۱)

ڈاکٹر سید عبد اللطیف (حیدر آباد دکن)، نے جو ثقافتی منطقے (CULTURAL ZONES) کی اسکیم پیش کی ہے۔ اس کی بنیاد بھی یہی مفروضہ ہے کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں

اسکیم کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

"چونکہ قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء میں جو دستور تجویز کیا گیا ہے وہ مسلمانوں کیلئے ناقابلِ قبول ہے کیونکہ:۔

(الف) یہ دستور اس مفروضے پر مبنی ہے کہ ہندوستان کی آبادی ایک مخلوط (COMPOSITIVE) قوم (NATION) پر مشتمل ہے۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں اور نہ آیندہ اس کی توقع کی جا سکتی ہے، کیونکہ اس ملک کی دو بڑی قومیں دو مختلف معاشرتی نظام سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور اپنی زندگی میں اساساً مختلف مذاہب اور تہذیبوں سے رہنمائی کرتی ہیں"۔

("تبادل دستور ہند" صفحہ ۶)

شائع کردہ دائرہ طلوع اسلام دہلی

تقسیم ہند کی ایک اسکیم علی گڑھ کے دو پروفیسروں (پروفیسر سید ظفر الحسن وغیرہ) نے بھی مرتب کی ہے۔ آپ نے بھی تقریباً انھیں خیالات کا اظہار کیا ہے۔ دستور حکومت ہند ۱۹۳۵ء پر نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اس کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ یہ (مذکورہ دستور) اِس ناقابلِ انکار حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا کہ ہندوستان کے مسلمان، ہندوؤں سے قطعاً علیحدہ ایک قوم ہیں جو اپنے تصوّرات اور عزائم میں ہندوؤں سے بالکل متضاد ہیں، اور وہ کسی دوسری قوم میں ضم نہیں ہو سکتے۔ . . . .

. . . .

ہم اِس امر کے قائل ہیں کہ ہم ہندوستانی مسلمانوں کو اور باتوں کے علاوہ اس امر پر بھی زور دینا چاہئے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ وہ

ایک علیحدہ قومی وجود کے مالک ہیں جو ہندوؤں اور دوسری غیر قوموں سے قطعاً مختلف ہے۔"

کوتاہی ہوگی اگر ہم اس "دو قومیت کے نظریے" (TWO NATION THEORY) کے متعلق قائدِ اعظم مسٹر محمد علی جناح کے خیالات نہ پیش کریں جو آج پاکستان اسکیم کے سب سے بڑے وکیل ہیں۔ ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کے اجلاس لاہور میں خطبۂ صدارت دیتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:۔

"برطانی مدبرین یہ صریحی غلطی کرتے ہیں کہ وہ ہندستان کے متضاد عناصر کو، جو ایک ہزار سال کے روابط کے باوجود آج مختلف ہیں، متحد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ توقع کبھی بھی قائم نہیں کی جا سکتی کہ یہ دو قومیں کسی 'جمہوری دستور' کے ماتحت یکجا کیجا سکتی ہیں۔ یا انہیں برطانوی پارلیمنٹ کے کسی دستور کے ماتحت زبردستی متحد رکھا جا سکتا ہے۔

"ہندستان کا مسئلہ فرقوں کا مسئلہ (INTER-COMMUNAL) نہیں بلکہ یہ بین الاقوامی (INTER-NATIONAL) مسئلہ ہے اس لئے جب تک اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین نہ کر لیا جائے، جو دستور بھی بنایا جائیگا اس کا نتیجہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوؤں اور برطانیہ کے لئے بھی تباہی کا باعث ہوگا، اگر واقعی حکومت برطانیہ اخلاص کے ساتھ اس چھوٹے برّ اعظم میں امن و امان اور خوشحالی دیکھنا چاہتی ہے تو اس کے سامنے صرف ایک راستہ ہے اور وہ یہ کہ ہندوستان کو آزاد قومی ریاستوں میں تقسیم کرکے ہندستان کی بڑی بڑی قوموں کو اپنا

اپنا وطن (HOMELAND) بنانے کی اجازت دیدے۔

"ہم پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہے کہ گذشتہ بارہ صدیوں کی تاریخ ہندستان میں اتحاد پیدا کرنے میں ناکامیاب رہی اور اس زمانہ میں ہمیشہ ہندستان، ہندو، اور مسلم، ہندستان میں منقسم رہا ہندستان کے موجودہ مصنوعی اتحاد کی تاریخ انگریزوں کی آمد سے شروع ہوتی ہے اور اسے برطانی سنگینوں کے زور سے قائم کیا گیا ہے۔

"قوم (NATION) کی جملہ تعریف کی مطابق ہندستانی مسلمان ایک قوم ہیں"

(اسٹیٹمین مورخہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء)

غرضیکہ یہ تمام اسکیمیں اپنے بنیادی مفروضے میں متحد ہیں۔ ان اقتباسات کے تجزیے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:۔

(۱) ہندو اور مسلمان علیٰحدہ علیٰحدہ دو قومیں ہیں اور ان کے درمیان سوائے ایک غیر ملکی حکومت کی غلامی کے اور کوئی چیز مشترک نہیں۔

(۲) ہندستان ایک ملک نہیں بلکہ ایک چھوٹا برّ اعظم ہے اسے کبھی ایک ملک، نہیں شمار کیا گیا اور شمالی مغربی صوبے ہمیشہ اس سے علیٰحدہ رہے۔

یہی وہ مفروضات ہیں جن پر پاکستان کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ لہٰذا ہمیں اِن دعاوی کا ذرا تفصیل کے ساتھ مطالعہ کرنا ہے قبل اس کے کہ ہم اس امر پر غور کریں کہ ہندو اور مسلمان ایک قوم کہے جا سکتے ہیں یا نہیں، ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ موجودہ دنیا میں قوم کے کیا معنی ہیں۔

قوم کسے کہتے ہیں؟

قوم کی تعریف

قومیت کے عناصرِ ترکیبی

موجودہ دور میں جن عوامل (FACTORS) سے قومیتوں کی تعمیر ہوتی ہے وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اشتراکِ وطن

(۲) اشتراکِ زبان

(۳) مشترک تاریخ

(۴) مشترک کلچر

(۵) معاشی و اقتصادی اغراض کا اشتراک

(۶) سیاسی اتحاد

یہ ہیں وہ عناصر جو موجودہ دور میں ایک قومیت بناتے ہیں لیکن اس دور سے پہلے دو عناصر ایسے تھے جو قومیت کی ترتیب میں بہت زیادہ فیصلہ کن ہوتے تھے۔ یعنی نسل اور مذہب۔ قبل اس کے کہ ہم مندرجۂ بالا عوامل پر غور کریں۔ ہمیں یہ سمجھ لینا ہے کہ موجودہ دور میں نسل اور مذہب تعمیر قومیت میں کیوں فیصلہ کن نہیں۔

وحشت سے مدنیت کی طرف انسان کا جب پہلا قدم اٹھا تو وہ نسلی گروہوں میں رہنے لگا، لوگ قبائلی (TRIBAL) شکل میں کسی ایک جغرافیائی حدود کے اندر رہتے تھے اور ان حدود میں کسی دوسرے نسل کے انسان کا بود و باش اختیار کرنا ناممکن تھا۔ کیونکہ ان میں نسلی عصبیت بہت زیادہ تھی اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کو دیکھ نہ سکتا تھا۔ اسی لئے اکثر وہ آپس میں برسرِ پیکار بھی رہا کرتے تھے۔ یہی قبائلی نسلیں رفتہ رفتہ ترقی کرتی گئیں اور ان سے آریَن، مغلؔ۔ سامیؔ۔ گاتھکؔ۔ سیکسنؔ۔ وغیرہ قومیں بنیں۔ لیکن جیسے جیسے یہ نسلی قومیں بڑھتی اور پھیلتی گئیں ان کے قدیم جغرافیائی حدود ان کو سمونے اور ان کے لئے خورد و نوش کا سامان بہم پہنچانے میں ناکافی ثابت ہونے لگے۔ چنانچہ تقریباً ایک ہزار برس تک دنیا کی تاریخ میں ایک یہی کام ہوتا رہا کہ یہ ٹڈی دل قومیں اپنے وطن سے ہجرت کرکے دوسرے دوسرے ملکوں میں جاکر بستی رہیں۔

دوسرے ملکوں میں جاکر بسنے میں قدرتی طور پر انھیں قدیم مقامی باشندوں سے برسرِ پیکار ہونا پڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو طاقتور قوم ہوئی اس نے دوسری

قوم کو مار بھگایا لیکن اکثر ایسا ہوا کہ نووارد قوم ملک کے ایک حصّے میں رہنے لگی اور قدیم باشندے دوسرے حصّے میں۔ جیسا کہ ہندستان میں آرین اور دراوڈی قومیں۔ اگرچہ نووارد اور قدیم باشندے دونوں نے اپنی اپنی نسل کی محافظت میں کوئی کوتاہی نہ کی۔ لیکن آگے چل کر انھیں یقینی اپنی نسلی راسخ العقیدگی میں مصالحت کرنی پڑی پھر یہ بھی ہوا کہ وحدت نسل کا خیال ان میں سے رفتہ رفتہ جاتا رہا۔ غرضیکہ رفتہ رفتہ نسلی آمیزش بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ ہزاروں برس میں نسلوں کی اس طرح پھینٹ پھانٹ ہوئی کہ آج کوئی قوم اس امر کا دعویٰ نہیں کر سکتی کہ اس کی نسلی وحدت علیٰ حالہ قائم ہے۔ چنانچہ دنیا کی موجودہ قومیں مختلف نسلوں کی آمیزش سے بنی ہیں۔ انگریزی، جرمنی، فرانسیسی، روسی، اطالوی وغیرہ تمام قومیتیں، متعدد نسلوں کا مرکب ہیں۔ مثلاً اطالوی قوم رومن ٹیوٹن (TEUTON) یونانی اور عرب نسل سے بنی ہے۔ فرانسیسی قوم گال (GAUL) رومن، برٹن اور ٹیوٹن نسلوں سے مرکب ہے۔ جرمن قوم آرین، ٹیوٹن اور سیکسن قوم سے۔ وغیرہ وغیرہ خود ہندستان کو لیجئے۔ میرے خیال میں ہندستان سے زیادہ آمیزش تو دنیا میں کہیں نہیں ہوئی ہوگی۔ جس کی دلیل ہندستان میں متعدد رنگ اور کھوپڑی کی مختلف ساخت وغیرہ کا پایا جانا ہے۔

ہاں دنیا میں بعض قومیں اس نسلی آمیزش سے محفوظ ہیں۔ لیکن وہ وہی ہیں جو تمدّن سے دور رہیں۔ جیسے ابی سینیا کے حبشی اور افریقہ کی وحشی قومیں، امریکہ کے رڈ انڈین اور ہمارے ہندستان کے کول، بھیل، سنتال وغیرہ،

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ اس بیسویں صدی میں قومیت کے اس نسلی تخیل کو ایک بار پھر دہرایا گیا۔ اس نسلی تحریک کے علمبردار جرمن کی نازی (NAZI) پارٹی کے رہنما ہر ہٹلر ہیں۔ وہ جرمن قوم کی اساس جرمن نسلیت (GERMANIC RACE) پر رکھنا چاہتے ہیں۔ اسی تخیل کی بنا پر حال میں جرمنی سے سامی نسل کے لوگ یعنی یہودی ہزاروں کی تعداد میں نکالے گئے۔ لیکن ہر ہٹلر

کی اس پالیسی کی محرّک وحدتِ نسل کے تخیل سے زیادہ سیاست ہے اور وہ ایک سیاسی چال کی حیثیت رکھتی ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ جرمن قوم کے ہر شعبۂ زندگی پر یہودی بڑی طرح چھائے ہوئے تھے اور جرمن نسل کے متوسط طبقے کو ترقی اور اظہار کے مواقع کم تھے۔ ہر ہٹلر کو اپنی پارٹی کو کامیاب بنانے کیلئے متوسط طبقے کو خوش کرنا تھا۔ چنانچہ اس نے یہودیوں پر دھاوا بول دیا۔ ہٹلر اپنے وحدتِ نسل کے دعاوی میں کہاں تک سچا ہے وہ اس کے حال کے طرزِ عمل سے بھی ظاہر ہے جبکہ اس نے غیر جرمن قوموں کو بھی اپنے قبضے میں کر کے اپنی رائش (REICH) میں ملا لیا ہے۔

زمانہ قدیم میں تو قوم کا تخیل نسلی تھا لیکن ازمنۂ وسطیٰ (MIDDLE AGES) میں اس کا تخیل مذہبی ہو گیا۔ اور مذہب کی بنیاد پر قومیں بنیں۔ جیسے یہودی، عبرانی زرتشتی، نصرانی وغیرہ۔ ایک خاص مذہب کے پیرو عموماً اپنی محافظت کیلئے ایک ہی جگہ رہا کرتے تھے، اور چونکہ انھیں اپنے کافر بادشاہوں یا کافر قوموں (HEATHENS) سے لڑنا پڑتا تھا اس لئے ان کی سوسائٹی بہت گھٹی ہوئی ہوا کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ جب ان مذاہب کی ترقی ہوئی تو انھوں نے ملکوں پر قبضہ اور بادشاہت بھی شروع کی۔ لیکن ایک ملک میں عموماً ایک ہی مذہب کے لوگ رہا کرتے تھے یا دوسرے مذہب کے رہتے تھے وہ غلاموں کی زندگی بسر کیا کرتے تھے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں مذہبی رواداری نام کو نہ تھی۔ دوسرے مذاہب کے لوگوں کو زندہ جلا دینا عام بات تھی۔

ان مذاہب میں سب سے زیادہ نصرانیت کو عروج ہوا۔ جب عیسائیت فلسطین کے گوشہ سے ساری دنیا میں پھیلنے لگی اور مختلف قومیں جیسے رومن، یونانی، انگریز، جرمن وغیرہ عیسائی ہوئیں تو پھر مذہبی قوم نہ رہی بلکہ ایک عیسیت۔ مذہب کہلانے والی کئی قومیں ہو گئیں اور پھر انگریز عیسائی، فرانسیسی عیسائی، رومن عیسائی وغیرہ اس طرح ایک ہی مذہب کی ماننے والی الگ الگ قومیں ہو گئیں۔ ایک عالمگیر مذہب کیلئے

یہ ناممکن ہو گیا کہ وہ مذہب کی بنا پر قوم کی بنیاد رکھ سکے مختلف قوموں کی قومی عصبیتوں کو جو کہ انسانی فطرت تھی مذہب نہ مٹا سکا۔ آگے چل کر رومن امپایر (Roman EMPIRE) کی شکل میں اس مذہبی وحدت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی لیکن چونکہ یہ ادارہ قوموں کی عصبیتوں سے ٹکراتا تھا، اور ان کی آزادی میں خلل انداز ہوتا تھا اس لئے پارہ پارہ ہو گیا۔

دنیا کو مذہبی رواداری کا سبق سب سے پہلے اسلام نے پڑھایا۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ ایک ملک میں صرف ایک ہی مذہب کے لوگ رہ سکتے ہیں۔ اُسے اپنی صداقت پر بہت زیادہ بھروسہ تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ مسلمان جہاں کہیں بھی رہیں گے وہ دوسروں کو مسلمان بنالیں گے۔ اسی لئے حضرت ؐ نے صرف تبلیغ کی آزادی چاہی اور جب یہ نہ ملی تو ہجرت کر گئے۔ مسلمانوں کی آبادی کا کوئی علیحدہ گوشہ نہ بنایا۔ اسلام نے ہمیشہ مدافعانہ جنگ کی۔ اگر کفار اسلام قبول نہ کرتے تو ان پر صرف ایک ٹیکس (جزیہ) لگاکر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اسلام نے دین میں جبر و اکراہ کی تعلیم نہ دی۔ (لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ) جزیہ دینے کے بعد یہ کفار مسلمانوں کی پناہ میں آجاتے تھے اور مسلمان ان کے ساتھ عدل و انصاف، رواداری، اخلاق، اور انسانی شرافت کا سلوک کرتے تھے۔ ایک ہی ملک میں کافر و مومن ایک قوم کی طرح رہتے تھے، اور اسلامی حکومت ان دونوں کو ایک آنکھ سے دیکھتی تھی۔ رفتہ رفتہ اسلام بھی ایک عالمگیر مذہب ہو گیا، اور یورپ، افریقہ، ایشیا تمام ہی کثیر تعداد میں لوگ اس کے پیرو ہو گئے۔ قومیت کی بنا مذہب نہیں بلکہ وطنیت ہی رہی۔ چینی مسلمان، مصری مسلمان، ہندستانی مسلمان، تاتاری مسلمان، ایرانی مسلمان غرضیکہ ان مختلف قوموں نے اسلام تو قبول کر لیا لیکن ان کی قومیت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی وہ حسب دستور اپنی قوم (جن میں کفار بھی تھے) کے افراد رہے لیکن یہ تمام مسلمان ایک مذہبی وحدت میں بندھ گئے۔ اسلام کی آمد کے بعد تیس سال تک مذہبی وحدت کا ایک مرکز (خلافت) رہا لیکن اس کے بعد اس پر نسلی اور وطنی عصبیتوں کا غلبہ ہو گیا۔ اور وہ ایک قسم کی بادشاہت ہو گئی

غرضیکہ قوموں کی تعمیر کے یہ دو عناصر جنھوں نے زمانۂ قدیم اور ازمنۂ
وسطیٰ میں قوموں کے بنانے میں اس قدر عظیم الشان پارٹ ادا کیا، اب قوموں
کی تعمیر میں ممد و معاون نہیں۔ دنیا کی ساری قوموں کو دیکھ جائیے وہ مختلف العقائد
اور مذاہب سے بنی ہوئی ہیں، اور ان کے مشترک عمل، تعاون اور قومی کاموں
میں مذہب کا سوال نہیں اٹھتا۔ انگریز قوم میں یہودی اور نصرانی دونوں مذاہب کے
لوگ ہیں، چینی قوم، بودھ، عیسائی، اور مسلمانوں سے مرکب ہے۔ روسی قوم، عیسائی
مسلمانوں وغیرہ سے۔ ترکی قوم مسلمان، عیسائی اور یہودی سے۔ مصری قوم مسلمان
عیسائی، قبطی وغیرہ سے۔ ایرانی قوم مسلمان اور زرتشتی وغیرہ سے، جاپانی قوم بدھسٹ
شنٹو (SHANTO) اور عیسائی سے، وغیرہ وغیرہ۔

اشتراکِ وطن

تعمیرِ قومیت کا سب سے بڑا عامل (FACTOR) اشتراک
وطنیت ہے۔ ایک جغرافیائی حدود کے اندر رہنے والے گروہ
کا آپس میں مل جل کر رہنا ایک قدرتی بات ہے اور قدرت نے بھی ہر ملک کو اس
طرح سے الگ کر رکھا ہے۔ اور ان کی آب و ہوا خورد و نوش کی اشیاء وغیرہ ایسی
ہیں کہ ایک جغرافیائی ماحول میں ایک خاص وضع کے انسان ڈھل کر نکلتے ہیں۔ انسان
اپنے ماحول کی پیداوار ہے۔ یہ قدرتی ماحول کئی صدیوں میں ایک خاص قسم کے
انسان (قوم) بنانے میں کامیاب ہوتا ہے، جو دنیا کے دوسرے باشندوں سے
مختلف ہوتے ہیں۔ وہ ایک سا لباس پہنتے ہیں۔ جہد اللبقا کی ہر منزل پر وہ ایک دوسرے
کے معاون و مددگار ہوتے ہیں۔ ان کی تفریح اور دلچسپیاں ایک سی ہوتی ہیں، پھر
وہ ایک ہو کر مشترک دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں۔ غرضیکہ وہ سیکڑوں برس تک ایک ساتھ
رہتے سہتے اور آفاتِ ارضی و سماوی کا مقابلہ کرتے کرتے ایک دوسرے سے
ایک ابدی رشتہ میں بندھ جاتے ہیں جسے "وطنیت" کہتے ہیں۔

فطرتی طور پر انسان جس سرزمین پر بود و باش اختیار کرتا ہے اور جہاں اس کی
پشتیں گذر جاتی ہیں اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ جس سرزمین کا وہ اناج

کھاتا ہے، جس کی ندی کا پانی پیتا ہے اور جس پر وہ عیش و آرام سے رہتا ہے۔
اس سرزمین کو وہ ماں کی گود کی طرح سمجھنے لگتا ہے۔ وطن اس کے لئے ایک
فخر کی چیز ہو جاتی ہے جس کے لئے وہ اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہانے کیلئے
تیار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ 'وطن' کے لفظ کے ساتھ ساتھ اس کا کل عیش و آرام
زندگی کی کیفیات اور مستقبل وابستہ ہوتا ہے۔ یہ قومیں اپنے وطن کے نام سے
مشہور ہوتی ہیں، فرانس کے رہنے والے فرینچ؛ امریکہ کے باشندے امریکن،
انگلینڈ کے انگلش، جرمنی کے جرمن، عرب کے عرب، ایران کے ایرانی، اور ہندستان
کے رہنے والے ہندستانی۔ جس طرح جرمنی کے رہنے والے وہ آرین ہوں یا سامی
خواہ وہ گورے ہوں یا کالے خواہ مسلمان ہوں یا عیسائی جرمن ہی کہلائیں گے، اسی
طرح ہندستان کے باشندے خواہ وہ یہاں کی دو سو نسلوں میں سے کسی نسل کے ہوں
اور سیکڑوں مذاہب میں سے کسی کے پرستار ہوں، وہ کہلائیں گے ہندستانی۔
(INDIAN) ہی۔ غرضیکہ ملک اور اس کے باشندوں کے درمیان ایک ایسا ابدی
رشتہ قائم ہو جاتا ہے جو ناقابلِ شکست ہے۔

وطنیت میں شخصی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کی بھی گنجائش نہیں۔ اگر اتفاق سے کوئی
شخص اپنے وطن کو ناپسند کرتا ہے۔ یا اس سے منسوب ہونا نہیں چاہتا تو بھی دنیا
والے اُسے اس کے وطن ہی کے نام سے پکاریں گے۔ اگر کوئی ہندستانی 'ہندستان'
کو اپنا وطن سمجھنا باعث شرم سمجھتا ہے، اور ہندستانی قوم میں شمار کئے جانے کو
پسند نہیں کرتا تو بھی لوگ اُسے ہندستانی ہی کہیں گے۔ خواہ وہ کسی مذہب و ملت
کا ہو اور خواہ کسی نسل سے اُس کا تعلق ہو، وہ ہے یقینی ہندستانی۔ یہ قدرت کا
اٹل فیصلہ ہے اور تاریخ کا قانون۔ سیکڑوں سال سے بسے ہوئے ہندستانی
انگریزوں کو بھی آج ہم ہندستانی نہیں کہتے، بلکہ اینگلو انڈین کہتے ہیں۔ اور
پارسیوں کو، حالانکہ ہندستان میں رہتے بستے انھیں سیکڑوں برس گذر گئے لیکن
اب تک انھیں ان کے ایرانی نام یعنی پارسی (پارس کا باشندہ) ہی سے پکارا جاتا ہے۔

ڈاڑھی اور چٹیا، اور لباس و وضع سے خواہ ہم اپنے کو ایک دوسرے سے کتنا ہی مختلف کرلیں لیکن یہ بنائے ہوئے فرق ہیں ۔ قدرت نے تو ہمیں ہندستانی ہی پیدا کیا اور یہ مصنوعی تفریق ہٹا دو اور پھر دیکھو کہ کون پہچان سکتا ہے کہ یہ ہندو اور یہ مسلمان ہے ۔ اپنی خواہش سے ایک شخص جو آج بودھ ہے وہ کل مسلمان ہوسکتا ہے یا ایک مسلمان عیسائی ہوسکتا ہے ۔ لیکن اگر ایک ہندستانی انگریز ہونا چاہے تو وہ انگریز نہیں ہوسکتا، وہ ہزار انگریزی وضع میں رہے، ان کی زبان بولے، ان کا تمدن اختیار کرلے لیکن 'قومیت' کی قدرتی چھاپ تا دمِ زیست اس پر موجود رہے گی وہ کہا جائیگا ہندستانی ہی ۔

غرضیکہ دنیا کی تمام قومیں وطن ہی سے بنی ہیں اور وطن تعمیرِ قومیت کا سب سے بڑا عنصر ہے ۔

اشتراکِ زبان

قوموں کی تعمیر کا ایک اہم وسیلہ زبان بھی ہے ۔ کیونکہ جب تک تبادلۂ خیالات کا کوئی آلہ نہ ہو، اس وقت تک انسانوں کے درمیان باہمی تفاہم پیدا نہیں ہوسکتا ۔ زبان مدنیت کی سب سے بڑی ضرورت تھی ۔ اس لئے دنیا کے ہر ملک اور ملکوں نے چھوٹے سے چھوٹے خطوں نے بھی جیوں تیوں اپنی ایک زبان بنا ہی ڈالی ۔

قدرتی طور پر ایک قسم کی زبان بولنے والے لوگ اپنے کو ایک گروہ (یا قوم) سمجھنے لگے ۔ اُن کے بیچ سے اجنبیت کا پردہ ہٹ گیا ۔ اور رفتہ رفتہ یک زبان ہونے سے خیالات اور کردار میں ہم آہنگی پیدا ہونے لگی اور پھر رفتہ رفتہ زبان ہی کے وسیلہ سے ان کا ایک متحدہ کلچر پیدا ہوگیا ۔ زبان میں اُن کی تاریخ جمع ہوئی، موسیقی اور ادب آیا، علوم و فنون اکٹھا ہوئے، غرضیکہ ان کے ماضی، مستقبل اور حال کا پرتو زبان ہوگئی ۔ لہٰذا قدرتی طور پر ایک زبان بولنے والے اپنے کو ایک قوم کہنے لگے ۔ ہر ملک کی ایک زبان ہوئی جو اس ملک کے نام پر مشہور ہوئی، جیسے فرانس کی زبان فرنچ، روس کی روسی،

ایران کی ایرانی وغیرہ۔

قوموں کی زندگی سے زبان کا اس قدر لگاؤ ہے کہ تاریخ میں اکثر زبان کی ترقی وتنزلی قوموں کی ترقی وتنزلی سے منسلک رہی ہے۔ یونانی قوم نے عہد ماضیہ میں جو ترقی کی تھی وہ اُن کی اُس وقت کی زبان اور ادب سے ظاہر ہے۔ جب عربوں کا ستارہ چمکا اور وہ دُنیا کے بڑے حصّے پر قابض ہوگئے۔ تو ان کی زبان نے بھی ترقی کی ہندوستان کے عروج کے زمانے کا ہمیں ہندوستان کی زبان سے پتہ ملتا ہے۔ زبان قوموں کی ترقی اس کا کلچر، اس کا تمدّن اور اس کی سیاسی طاقت کا آئینہ ہے۔ اِسلئے ایک قوم کا ہمزبان ہونا بہت ضروری ہے۔

لیکن یہ ضروری نہیں کہ ساری قوم جب تک ایک زبان نہ بولے وہ قوم نہیں کہلا سکتی۔ ایک ملک اور قوم میں مختلف زبانیں بولی جاسکتی ہیں۔ سوئٹزرلینڈ میں تین زبانیں بولی جاتی ہیں پھر بھی وہاں کے باشندے سوئس (Swiss) قوم کہلاتے ہیں۔ روس میں تقریباً دوسو زبانیں اور بولیاں رائج ہیں پھر بھی انھیں روسی قوم کہا جاتا ہے۔ لیکن اس میں ضرورت اس امر کی ہے کہ جو زبانیں ہوں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہوں۔ تھوڑا بہت فرق قدرتی ہے۔ اتنا فرق تو ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ انگلینڈ، اسکاٹلینڈ اور آئرلینڈ میں انگریزی زبان ہی بولی جاتی ہے، لیکن سروں کے مدھم یا تیز ہونے اور لہجہ بدلنے سے تقریباً تین زبانیں ہوگئی ہیں۔ ایسا ہی فرق ضلع ضلع میں پایا جاسکتا ہے۔ مشرقی یوُ پی کے بلیا ضلع کے گاؤں کی زبان او مغربی یوُ پی کے بلند شہر اور سہارن پور کے اضلاع کی زبانوں میں اتنا فرق ہے کہ دو زبانیں معلوم ہوتی ہیں، لیکن وہ ہے ایک ہی زبان۔

اس لئے کسی قوم کا کثیر اللسان ہونا اس امر پر دلالت نہیں کرتا کہ وہ ایک قوم نہیں، اگر ایک قوم ایک سے زیادہ زبانیں بولتی ہے اور قومیّت کے دوسرے لوازم (مثلاً اشتراکِ وطن اور مشترک تاریخ، مشترک اغراض

معاشی، وغیرہ) پورا کرتی ہے تو اُسے 'قوم' کہا جائے گا۔ لیکن ہاں اِن زبانوں کی بولنے والوں کے مابین ایک زبان مشترک بھی ہونی چاہیئے۔ جیسے روس میں روسی زبان چین میں چینی زبان۔

یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ اگر ایک ہی زبان دو ملکوں میں رائج رہے تو اُن کے باشندوں کو ایک قوم نہیں کہا جائیگا۔ انگریز اور امریکن دونوں ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ لیکن وہ ایک قوم نہیں۔ اسی طرح عرب اور مصر کی زبان بھی ایک واحد زبان' یعنی عربی' ہے لیکن انھیں عرب قوم نہیں کہا جائیگا۔ کیونکہ وہ قومیّت کے دوسرے شرائط پورا نہیں کرتے ان کا وطن جدا ہے اُن کی تاریخ جدا ہے، اُن کی معاشی و سیاسی زندگی جدا ہے پھر انھیں ایک قوم کس طرح کہا جاسکتا ہے۔

غرضیکہ ہر قوم کیلئے زبان ایک ہونا ضروری ہے۔ مگر یہ عنصر غیر منفک نہیں۔ مختلف زبانیں بولنے والے گروہ بھی ایک قوم کہلا سکتے ہیں۔

تاریخی اشتراک

ایک قوم کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ اُس کی ترتیب تاریخی طور پر ہوئی ہو۔ اور تاریخ نے اُسے ڈھالا ہو۔ سچ پوچھو تو 'قوم' تاریخی ارتقا کا ایک نتیجہ ہے۔ اگر کسی قوم کی تعمیر تاریخ کے ہاتھوں نہیں ہوئی ہو تو ہم اُسے ایک قوم نہیں کہیں گے۔ کیونکہ یہ ضروری ہے کہ اُن کے ارتباط نئے نہ ہوں بلکہ سیکڑوں برس پُرانے ہوں اور ہر گروہ نے اس قوم کی تعمیر میں ہاتھ بٹایا ہو۔ انھوں نے وطن کے مشترک خطرات کا مقابلہ کیا ہو' ساتھ مل کر قومی حادثات جھیلے ہوں، مشترک قومی روایات رکھتے ہوں۔ غرضیکہ صدیوں تک اُن کی قسمت ایک ہی رشتہ میں بندھی رہی ہو۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم کسی شہنشاہیت کی مختلف مفتوح قوموں کو ایک قوم نہیں کہہ سکتے۔ حالانکہ ان کی تاریخ میں وحدت موجود ہے۔ مثلاً سکندرِ اعظم کے میسی ڈونیا سے لیکر پنجاب تک پھیلے ہوئے سامراج

کو ایک قوم نہیں کہیں گے کیونکہ وہ قومیت کے دوسرے لوازم (وطنیت، زبان اور
مشترک معاشی، مفاد وغیرہ) نہیں رکھتے اور انکی تعمیر تاریخی طور پر نہیں ہوئی بلکہ اضطراری
طور پر وہ ایک سیاسی رشتے میں منسلک ہو گئے۔ موجودہ دور کی بڑے پیمانہ کی شہنشاہیوں
کی مثال سے یہ بات اور صاف ہو جاتی ہے۔ انگریزی سامراج کے قبضہ و اقتدار
میں دنیا کے ہر بر اعظم کی قومیں ہیں لیکن ایشیا، امریکہ، افریقہ اور
یورپ کی انگریزوں کی محکوم قوموں کو ایک قوم نہیں کہا جا سکتا، حالانکہ وہ
ایک ہی سیاسی رشتے میں منسلک ہیں اور انکی تاریخ ایک ہی جیسی ہے۔

غرضیکہ ایک قوم وہ ہے جو ایک مشترک وطن میں رہتی ہو اور اس کی ترتیب اور
ارتقا تاریخی طور پر ہوئی ہو نہ کہ اضطراری طور پر۔ ہندستان میں سیکڑوں برس بود و
باش رکھنے پر بھی آج ہم اینگلو انڈین کو ہندستانی ماننے کیلئے تیار نہیں اور ان
کے ساتھ اینگلو کا لفظ موجود ہے۔ جو ہندستانی سمندر پار کے ملکوں میں
جیسے زنجبار، جنوبی افریقہ، کینیا، ٹنگانیکا وغیرہ میں آباد ہیں انھیں ہندستانی ہی کہا
جاتا ہے، حالانکہ اب ان کی قومیت اور وطنیت بدل گئی۔ اگر ایک گروہ جرمنی سے
ہجرت کر کے ہندستان چلا آئے۔ اسے اپنا وطن بنا لے، اور ہندستانی
زبان بولنے لگے تو ہم اسے ہندستانی قوم کا ایک جزو تصور کرنے کو تیار
نہ ہوں گے تا وقتیکہ اس کی پشتیں یہاں نہ گذر جائیں۔ اور تاریخی حیثیت سے
وہ گھل مل کر ہندستانی نہ ہو جائے۔

مشترک کلچر ایک قوم کی تعمیر کے لئے کلچر ایک بہت اہم عنصر ہے! اور یورپ
میں تو قومیت کی تقسیم میں کلچر (ثقافت) کو اولیت دی جاتی ہے۔ کلچر
کی تشریح کرنے کے پہلے ایک بات میں یہاں صاف کر دینا چاہتا ہوں۔ کلچر
کے مفہوم میں مذہب شامل نہیں۔ اور میری مراد یہاں مذہب سے نہیں، بلکہ مذہب کے
علاوہ جن چیزوں کو کلچر میں شامل کیا جاتا ہے ان سے ہے۔

ایک خاص انسانی حدود اور اس کے مخصوص ماحول میں ذہنی اور دماغی تربیت کا نام کلچر ہے۔
ایک قوم کے درمیان صدیوں کی بود و باش سے جو مخصوص طرز معاشرت، رسم و رواج، روایات، آداب و رسوم، لباس، وضع اور مذاق پیدا ہو جاتا ہے اسی کو کلچر کہتے ہیں، جو پشت ہا پشت سے ایک قومی ورثہ کی شکل میں چلا آتا ہے۔ کلچر کا بہترین جلوہ ادب، شاعری، مصوری، موسیقی، سنگتراشی، فن تعمیر اور مخصوص اداروں میں نظر آتا ہے۔ جس قوم کا ادب شاعری، موسیقی وغیرہ جتنی ہی زیادہ ترقی یافتہ ہوتی ہے، اسی قدر اس قوم کو دنیا کی نظر میں سربلندی حاصل ہوتی ہے۔ خاص کر موجودہ زمانے میں ایک قوم کیلئے متحدہ کلچر ہونا جزو لاینفک کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ کلچر ہی ایک قوم کے مزاج، اور کردار کو مرتب کرتا ہے۔ آج انگریز، جاپانی، جرمن فرانسیسی اور ترکی وغیرہ قوموں میں ہمیں جو خصوصیات نظر آتی ہیں اور ان کا جو کردار ہمارے سامنے ہے وہ ان کے مخصوص کلچر ہی کی ودیعت ہے۔

لہذا ایک متحدہ قوم کے پاس اس کا ایک متحدہ کلچر بھی ہونا لازمی ہے۔ ہاں تھوڑا بہت فرق ہو سکتا ہے۔ جو دنیا کی ہر قوم میں موجود ہے۔ زبان کی طرح کلچر بھی ہر سو میل پر ماحول کا اثر قبول کرتا جاتا ہے، اور ادلتا بدلتا رہتا ہے۔ بلکہ محدود معنوں میں ہر خاندان میں کلچر کی شکل و شباہت میں خفیف فرق پایا جاتا ہے۔ لیکن تفصیلات سے قطع نظر وسیع زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو ہر قوم کا ایک کلچر ہوتا ہے۔ کلچر کو ایک ٹھوس چیز سمجھنا غلطی ہے۔ یہ ایک سیال مادے کی طرح ہے جو بہت جلد بیرونی اثرات کو قبول کرتا ہے۔ دنیا کے موجودہ کلچروں کی تشکیل میں مذہب نے بڑا کام کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اوائل زمانہ میں مذہبی کلچر ہی ہوا کرتے تھے۔ پرانی مذہبی قومیں جیسے یہودی، عبرانی، عیسائی، مسلمان، ان کا مذہبی کلچر تھا۔ لیکن جیسے جیسے یہ عالمگیر مذاہب وطنی حدود سے نکل کر وسعت اختیار کرتے گئے، کلچر کی قید سے نکلتے گئے۔ یہاں تک کہ آج صرف ایک عیسائی مذہب کے ماننے والوں کا دنیا کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک سیکڑوں کلچر ہے۔ لیکن مذہب ایک ہی ہے۔ ہاں مذہب نے اپنے ماننے

والوں کے ساتھ کلچر کی ایک شق ایسی چھوڑی ہے جو خواہ کسی قوم یا کسی کلچر کے بیچ ہو وہ عام طور پر مشترک ہے اور یہ ہے کلیسا، خانقاہ، وغیرہ۔ چھوٹے چھوٹے فرق کے سوا ایک مخصوص مذہب کے کلرجی CLERGY میں خواہ وہ کسی وطنیت سے تعلق رکھتے ہوں، کوئی بہت زیادہ فرق نہیں پایا جاتا۔

بہرحال اس چھوٹے سے طبقے کے سوا۔ ہر قوم کا ایک جدا کلچر ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو دنیا کی کسی دو قوم میں مشترک نہیں پائی جاتی۔ ایک قوم کی اصلی پہچان اس کا کلچر ہے۔

لیکن موجودہ دور ترقی میں تمام متمدن ملکوں کا کلچر ایک سمت کو جاتا دکھائی دیتا ہے۔ مغرب، دنیا کے کلچر پر بُری طرح چھا رہا ہے۔ ہر ملک کے دولتمند اور تعلیمیافتہ تقریباً ایک ہی طرح رہتے سہتے اور ایک ہی جیسی چیزوں سے دلچسپی لیتے ہیں۔ ان کے تفریحی لوازم میں بھی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ایک انگریز دولتمند اور ایک چینی، اور ایک ہندستانی دولتمند کی رہایش میں کچھ زیادہ فرق نظر نہ آئیگا۔ بہت ممکن ہے آگے چل کر ساری دنیا کا ایک کلچر ہو جائے۔

اقتصادی و معاشی اغراض کا اشتراک

ایک قوم کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے معاشی مفاد یکساں ہوں اور وہ ایک اقتصادی رشتے کی طرح آپس میں گتھی ہوئی ہو۔ اگر ملک میں خوش حالی آئے تو قوم کا ہر فرد فارغ البال نظر آئے اور اگر بدحالی آئے تو اسی طرح قوم کے تمام افراد پر اس کا اثر پہنچے۔ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں یہ ممکن ہے کہ قوم کے بعض طبقوں پر یہ حالات اثر انداز نہ ہوں۔ لیکن میری مراد قوم کے ۹۵ فی صدی افراد سے ہے۔ غرضیکہ ترقیؔ و تنزلی ہر حال میں ساری کی ساری قوم متاثر ہو اور وہ ایک واحد معیشتی نظام میں بندھی ہوئی ہو۔

دنیا میں انسان کا سب سے بڑا مسئلہ روٹی کا ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ روٹی ہی کے سوال سے ہمارا موجودہ تمدن اور قومیں پیدا ہوئی ہیں۔ جب انسان

جانوروں کی طرح جنگلوں میں رہا کرتے تھے۔ تو یہی پیٹ کا سوال تھا جو انھیں گروہ بنانے، ساتھ مل کر جانوروں کا شکار کرنے، اپنے کھانے پینے کی چیزیں یکجا رکھنے اور ان کی محافظت کیلئے بستیاں بسانے، اور پھر آگے چل کر کھیتی کرنے، مویشی پالنے اور اپنی زمینوں کو بچانے کیلئے دوسرے گروہوں سے جنگ کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر روٹی کا سوال نہ ہوتا تو پھر دوسری ایسی کوئی چیز دنیا میں نہ تھی جو ایک انسان کو دوسرے انسان سے ملنے پر مجبور کرتی۔ دنیا کارزارِ زندگی ہے اور اس میں وہی قومیں کامیاب و کامران رہتی ہیں جو زیادہ سے زیادہ متحد اور اپنی اقتصادی خوشحالی کو بڑھانے کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت رکھتی ہیں۔ غرضیکہ اقتصادی اتحاد ایک قوم کے درمیان کئی قسم کے مزید اتحاد و اشتراک پیدا کر دیتا ہے۔ وہ ایک ساتھ مل کر ملکی دولت پیدا کرتے ہیں، اقتصادی بربادی کے موقع پر ایک ساتھ مل کر اس کا مقابلہ کرتے ہیں، اپنے اقتصادی مفاد کی محافظت اور اس کی توسیع کیلئے دوسری قوموں سے صلح اور جنگ کرتے ہیں۔ غرض اقتصادی یکجہتی کی بنا پر قوموں میں ایک خاص تمدن و کلچر بھی پیدا ہوتا ہے۔ جو قوم جس قدر زیادہ خوشحال ہوتی ہے اس کا کلچر بھی اتنا ہی ترقی یافتہ ہوتا ہے۔

غرضیکہ ایک قوم کی ترقی و تنزلی، خوشحالی و بربادی اور اس کا سود و زیاں یکساں ہونا ضروری ہے۔ یہ اتنا ہی ضروری ہے کہ اگر کسی قوم میں اس چیز کا فقدان ہے تو ہم اُسے 'قوم' نہیں کہہ سکتے۔ اگر امریکہ کی مختلف ریاستیں کسی مشترک اقتصادی بندھن میں نہ بندھی ہوتیں تو ہم اِسے متحدہ امریکن قوم نہیں کہہ سکتے تھے۔ یا چین کے باشندوں کے معاشی مفاد یکساں نہ ہوتے تو انھیں ایک 'قوم' نہیں کہا جاتا۔ لیکن اگر کسی قوم میں صرف اقتصادی و معاشی اشتراک ہو، اور قومیت کے دوسرے لوازم جیسے وطنی اشتراک، کلچر، وغیرہ نہ ہوں تو ہم اُسے قوم نہیں کہہ سکتے۔ برعکس اس کے اگر یہ تمام لوازم موجود ہوں اور اقتصادی

اشتراک نہ ہو تو بھی اُسے قوم نہیں کہا جا سکتا مقصد یہ ہے کہ یہ تمام لوازمات لازم و ملزوم ہیں۔

اتحّادِ سیاسی

تعمیرِ قومیت کے لئے سیاسی اشتراک بھی نہایت ضروری ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ایک قوم کسی واحد سیاسی ادارے کے ماتحت ہو۔ قومیت کے لئے یہ لازمی نہیں کہ وہ آزاد ہی ہو۔ اس وقت ایشیا و افریقہ کی سیکڑوں قومیں مغربی قوموں کی غلام ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی قومی حیثیت جاتی رہی۔ آزاد ہو یا غلام، اگر ایک قوم میں، قومیت کے دوسرے لوازم موجود ہیں تو اُسے یقینی ایک قوم کہا جا سکتا ہے۔ لیکن شرط یہی ہے کہ محکومیت اور آزادی دونوں حالات میں وہ مشترک رہی ہوں۔ غلام رہی ہوں تو کسی ایک حاکم کی، اور اگر آزاد ہوں تو بھی تو ان پر کسی واحد سیاسی نظام کی حکومت ہو۔

سیاسی اتحّاد نہ رہنے کے سبب قوم مختلف حصّوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔ دنیا میں اِس کی مثالیں بھری پڑی ہیں۔ سرحد کے آزاد قبائل حکومتِ افغانستان میں شامل نہ ہونے کے سبب افغان نہیں کہے جاتے اور وہ افغانی قوم میں شامل نہیں۔ صوبۂ سرحد کا ہندستان کے ساتھ سیاسی تعلق ہونے کی وجہ سے پٹھان ہندستانی کہے جاتے ہیں اور اب وہ ہندستانی قوم کے ایک جزو ہو گئے ہیں۔ لیکن اگر وہ دولتِ افغانستان کے ماتحت ہوتے تو ان کا شمار یقینی افغان قوم میں ہوتا۔ اِسی طرح آئرلینڈ کی، برطانی پارلیمنٹ سے علٰحدگی کے سبب آئرش اب ایک علٰحدہ قوم بن گئے ہیں۔ اگر اسکاٹ لینڈ بھی اِسی طرح برطانوی پارلیمنٹ سے علٰحدہ ہو جائے تو اِسے یقینی انگریز قوم میں نہ شمار کیا جائے گا۔ فلسطین کے عرب اور عرب کے عرب، الگ الگ دو قوم تصور کئے جاتے ہیں لیکن اگر کسی واحد حکومتی ادارے میں ہوتے تو انھیں ایک ہی قوم کہا جاتا۔ سیلون اور برما کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے۔ سیلون اور برمی زمانۂ دراز تک ہندستانی کہے جاتے رہے۔ لیکن اب سیاسی علٰحدگی کے بعد وہ ہندستانی قومیت سے بھی جُدا ہو گئے۔ لہذا ایک قوم کیلئے ایک واحد سیاسی نظام کی ماتحتی بے حد ضروری ہے۔ جسکی عدم موجودگی

میں موجودہ دنیا اِسے ایک قوم تصوّر نہیں کر سکتی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کیا فرنچ انڈیا کے ہندستانی ایک دوسری شہنشاہیت کا جزو ہونے کی وجہ سے ہندستانی نہیں رہے؟ بیشک ہمیں اُنھیں ہندستانی قوم کا ایک جزو کہنے میں تامّل ہوگا۔ کیونکہ ایک قوم کے درمیان جو سیاسی و اقتصادی وحدت ہونی چاہئے۔ وہ اب ان میں موجود نہیں اور یہ دونوں لوازم موجودہ تخیّل قومیت کے مطابق اشد ضروری ہیں۔

ہندستان کی کوئی سیاسی و اقتصادی تبدیلی ان پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ لیکن صرف سیاسی نظام کے اشتراک ہی سے ایک قوم نہیں بن جاتی، تاوقتیکہ اس میں دوسرے لوازم جیسے وطنیت کلچر اور معیشی و اقتصادی اتحاد وغیرہ موجود نہ ہوں۔ عدن، مصر اور یہاں تک کہ چین کے کچھ حصّے بھی انگریزی اقتدار کے ماتحت ہیں لیکن چینی، مصری، عربی اور ہندستانیوں کو اس بنا پر ایک قوم نہ کہا جائے گا کہ وہ ایک انگریزی سیاسی نظام کے ماتحت ہیں۔

لیکن قومیتوں کی تعمیر میں حکومت کا حصّہ کچھ کم نہیں رہا ہے۔ اوائل تمدن میں یقینی دنیا نہایت چھوٹی چھوٹی "سرداریوں" میں بنٹی ہوئی تھی لیکن اولوالعزم بادشاہوں نے جہاں تک اپنی سلطنت پھیلائی یہ چھوٹی چھوٹی قومیں اور ریاستیں ایک نظام کے ماتحت آکر ہزاروں برس کے میل جول سے ایک قوم بن گئیں۔ عبرانی۔ مصری اور لاطینی قومیں انھیں چھوٹی چھوٹی قبائلی قوموں سے ایک بادشاہ کے زیر اثر ہو کر بنیں۔ اسی طرح فرانس کے ایک چھوٹے سے راجہ کی سلطنت جہاں تک پھیلی وہ فرانس ملک کہلایا اور اس کے باشندے فرانیسی قوم۔ انگلستان کی سلطنت مختلف ٹکڑوں میں منقسم تھی جسے (HEPTARCHY) کہتے تھے۔ لیکن جب یہ تمام سلطنتیں ایک حکمران کے قبضہ میں آگئیں تو ایک انگریز قوم بن گئی۔ خود ہندستان میں متحدہ قومیت کی تعمیر میں سلاطین اسلام نے اہم خدمات انجام دیں ہندستان کو ایک سیاسی وحدت مسلم سلاطین ہی نے بنایا۔ مسلمانوں کی سلطنت جہاں تک پہنچی، اس کے باشندے ایک واحد قومیت کے سانچے میں ڈھلنے لگے۔ کلچر جو قومیت کا ایک اہم جزو ہے حکومت کی ماتحتی میں بڑھتا ہے، اور نئے نئے عناصر کے امتزاج سے ایک جدید کلچر پیدا ہوتا ہے۔

غرضیکہ متحدہ قومیت کے لئے حکومت کا اشتراک لازمی ہے۔

حاصل کلام بہر حال اس مباحثے سے یہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ قومیت کی تعمیر کیلئے حسب ذیل عناصر نہ صرف لازمی بلکہ لازم و ملزوم ہیں :- (۱) اشتراک وطن (۲) کلچر کا اشتراک (۳) معاشی واقتصادی اغراض کا اشتراک اور (۴) سیاسی اشتراک۔ یہاں ہم نے تاریخی اور لسانی اشتراک کے عناصر نظر انداز کردئے ہیں۔ یہ اس لئے کہ اگر ساری قوم میں ایک واحد زبان نہ بھی ہو تو بھی ایک قوم بن سکتی ہے۔ تاریخی اشتراک کا عنصر ہم نے اسلئے نظر انداز کردیا کہ تاریخ کا اشتراک اور مشترک کلچر قریب قریب ہم معنی فقرے ہیں۔ جب تک ایک قوم کی صدیوں تک مشترک تاریخ نہ رہی ہو متحدہ کلچر پیدا نہیں ہو سکتا۔ کسی قوم کا تاریخی طور پر مرتّب ہونا، اور متحدہ کلچر ہونا ایک ہی معنی رکھتا ہے۔ جب ہم کسی قوم کا تاریخی طور پر مرتّب ہونا کہتے ہیں تو اس سے ہماری مراد یہ ہی ہوتی ہے، کہ وہ صدیوں تک ایک ساتھ رہی ہو ، اجنبیت جاتی رہی ہو اور عرصہ دراز کے باہمی اختلاط سے اس کے درمیان بہت سی مشترک عادات ، رسومات ، اور مذاق پیدا ہوگیا ہو۔

غرضیکہ متحدہ قومیت کے یہ چار عناصر ایسے ہیں جن میں سے ایک کی عدم موجودگی سے بھی 'قوم' باقی نہیں رہتی۔ یہ چاروں عناصر لازم و ملزوم ہیں۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ نسلی یا مذہبی اشتراک کوئی چیز ہی نہیں۔ ایک قوم کے درمیان جتنے قسم کے اشتراک بھی ہوں وہ اُسی قدر اس قوم کو مضبوط بناتے ہیں۔ اگر ایک قوم میں مندرجہ بالا لوازم کے ساتھ ساتھ نسلی یا مذہبی اشتراک بھی موجود ہوں تو یہ اور زیادہ بہتر ہے۔ لیکن اگر نسلی یا مذہبی اشتراک نہ بھی موجود ہو اور اگر اس قوم میں مندرجہ بالا چار خصوصیات موجود ہوں تو اُسے 'قوم' کہا جاسکتا ہے۔ اگلے صفحات میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ قومیت کی یہ تعریف ہندوستان کے مسلمان، ہندو اور دوسرے فرقوں پر کہاں تک منطبق ہوتی ہے اور یہ عناصر اربعہ ہمارے درمیان کس حد تک موجود ہیں۔

کیا ہندو اور مسلمان ایک قوم نہیں؟

وطنی، نسبی، اقتصادی اور سیاسی تعلقات

پچھلے صفحات میں قوم کی جو تعریف کی گئی ہے، اُس کی روشنی میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہندستان میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی وغیرہ جو فرقے بستے ہیں انھیں مِلاکر، ہندستانی قوم کہا جا سکتا ہے یا نہیں۔

متحدہ قومیت کے جو عناصر (وطنی، لسانی، تاریخی، ثقافی (کلچرل)، معاشی وسیاسی اشتراک) کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں بعض تو ایسے ہیں جن پر بحث وتمحیص کی مطلق گنجایش نہیں۔ مثلاً وطنی اشتراک۔ اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ اس ملک میں جتنے فرقے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین، بودھ وغیرہ بستے ہیں، ہندستان ان سبھوں کا مشترک وطن ہے۔ اس کی سرزمین پر ایک مسلمان کا اتنا ہی استحقاق ہے جتنا ایک ہندو کا، کوئی ایک فرقہ اس امر کا دعویدار نہیں ہو سکتا کہ ہندستان صرف اُسی کا ہے اور اس پر دوسرے کا حق نہیں۔ غیر ممالک کے لوگ بھی اس ملک کے رہنے والوں کو خواہ وہ ملک کے کسی حصّے سے تعلق رکھتے ہوں، یا کسی مذہب وملّت کے پیرو ہوں، ہندستانی ہی کہتے ہیں۔ بلکہ امریکہ میں تو سارے ہندستانیوں کو 'ہندو' کہا جاتا ہے۔ خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو۔ اگر کسی اجنبی ملک میں کسی ہندستانی مسلمان سے پوچھا جائے کہ "آپ کون ہیں" اور وہ یہ جواب دے کہ 'مسلمان' تو اس کا اتنا کہنا کافی نہ ہوگا۔ بلکہ دوبارہ یہ سوال کرنا پڑے گا کہ آپ کی قومیت (NATIONALITY) کیا ہے، مسلمان، توٹرکی، ایران، افغانستان، چین، روس، مصر، عرب، عراق، ملایا وغیرہ ہر جگہ بستے ہیں۔ صرف مسلمان کہنے سے بات سمجھ میں نہ آئے گی۔ لہذا اسے اپنے کو ہندستانی کہنا ہوگا۔ ہاں وہ یہ کرسکتا ہے کہ اپنی قومیت بتلانے کے بعد یہ بھی کہدے کہ میں مذہب اسلام کا

پیرو ہوں، عرب کے مسلمان تو صرف ہمیں ہندی ہی کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہندستان میں کسی بدیسی مسلمان سے ہماری ملاقات ہو تو ہمیں اس کی قومیت یقینی پوچھنی پڑے گی۔ اس کا محض مسلمان کہنا کافی نہ ہوگا۔ اُسے بتانا پڑے گا کہ وہ افریقی، چینی، جاپانی، افغانی، ایرانی، روسی یا الجیری، کون سا مسلمان ہے۔

غرضیکہ متحدہ قومیت کا سب سے بڑا عنصر۔ یعنی وطن ہم سب میں مشترک ہے۔ ہندستانی کی تعریف ہم سب پر صادق آتی ہے اور وطنی جامعیت ہم سب کو باندھتی ہے۔ اس کی خوشنامی اور بدنامی دونوں میں ہم سب برابر کے شریک ہیں۔ اسکی کامیابیاں ہم سب کیلئے باعثِ فخر اور اس کی کوتاہیاں ہم سبھوں کیلئے باعثِ شرم ہیں۔ رستم ہند گاما کی "ورلڈ چمپین شپ" پر ہر ہندستانی کو ناز ہے اور نواب پاٹودی اور رنجی کے کھیلوں نے دوسرے ملکوں میں ہم سبھوں کا نام اونچا کیا ہے۔ مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری، جواہر لال نہرو اور سوبھاش چندر بوس نے یورپ میں جو تقریریں کیں اور ان سے یورپینوں پر ہندستانیوں کا جو سکّہ جما اس سے ہم سبھوں کی عزت بڑھی۔ اسی طرح مصطفےٰ صغیر (جس نے کمال اتاترک پر گولی چلائی تھی) کی حرکت نے سارے ہندستانیوں کو دنیا کے سامنے مطعون کیا۔ مس میو نے ہندستان کی جو توہین کی تھی اس پر ہندو، مسلمان سارے ہندستانی چیخ پڑے تھے۔ اسی طرح چین نے ڈاکٹر ٹیگور، پنڈت نہرو وغیرہ کی خدمت میں جو خراج تحسین پیش کیا اس سے ہم تمام ہندستانیوں کا سر اونچا ہوا۔

غرضیکہ اشتراک وطن کے سبب ہم سب ہندستانی ہیں۔ ہماری وطنیت ایک ہی ہے۔ اور ہم ہندو مسلمان اپنے وطن کی نسبت سے ہندستانی ہیں۔

ہندستان کی نسلیں

کلچرل، لسانی اور تاریخی اشتراک پر آگے چل کر ذرا تفصیل کے ساتھ عرض کروں گا، کیونکہ اصل مابہ النزاع یہی کلچر ہے، جس پر ہندستانی مسلمانوں میں دو رائیں ہیں اور جسکی بنیاد پر پاکستان کی یہ ساری عمارت کھڑی کی گئی ہے۔ سر دست ہم ہندستانی قومیت کے دوسرے عناصر یعنی نسلی، معیشی اور سیاسی اشتراک

پر غور کرلیں۔ جہانتک نسل کا تعلق ہے، یہ امر مسلمہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں نسبیت متحدہ قومیت کیلئے ضروری سمجھی بھی نہیں جاتی۔ لیکن اگر یہ موجود ہو تو اس میں شبہ نہیں کہ اس سے قومیت کو بہت زیادہ تقویت پہنچتی ہے۔ لیکن ہندستان نسلی اعتبار سے قطعاً متحد نہیں۔ جب تاریخ کی صبح بھی نمودار نہ ہوئی تھی، اُسی وقت سے ہندستان مختلف نسلوں کی جولانگاہ بنا ہوا تھا۔ کچھ پتہ نہیں کتنے ہی نسل کے لوگ ہندستان میں آئے اور اس سمندر میں گھل مل گئے۔ لیکن تاریخ جہاں تک ہماری رہنمائی کرتی ہے اس سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اسوقت ہندستان میں جتنے گروہ بسے ہوئے ہیں انھیں سات بڑی بڑی نسلوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) ہندستانی آریہ (۲) ترکی ایرانی (۳) سیتھین۔ ڈراویڈی (۴) آریہ ڈراویڈی (۵) مانگول ڈراویڈی (۶) مانگول ٹائپ (۷) ڈراویڈی۔

پاکستان کے چند مبلغین کا خیال ہے کہ نسلی طور پر مسلمان، ہندوؤں سے مختلف ہیں۔ لیکن یہ سراسر غلط ہے۔ ہندستان میں جو مسلمان آئے وہ خود بھی ایک نسل کے نہ تھے۔ ان میں ترک، مغل، تاتاری، عرب، ایرانی، پٹھان وغیرہ ہر نسل کے مسلمان تھے۔ اب بھی ان کی نسلیں ہندستان میں موجود ہیں۔ لیکن ہندستان میں ان نسلوں سے جو مسلمان ہیں ان کی تعداد سو میں پانچ سے زیادہ نہیں۔ ہندستان کے ۹۵ فیصدی مسلمان انھیں نسلوں سے ہیں جن سے ہندو ہیں اور ان کا تعلق مندرجہ بالا سات نسلوں میں سے کسی نہ کسی ایک سے یقینی ہے۔ مشرقی بنگال کے تقریباً دو کرور ۴۷ لاکھ مسلمان مانگول۔ ڈراویڈی (MONGOLO-DRAVIDIAN) ہیں اور وہ اسی نسب سے ہیں جس نسب سے بنگال کے برہمن اور کائستھ ہیں۔ ان لوگوں نے مسلمانوں کے عہد حکومت میں اسلام قبول کیا۔ اسی طرح پنجاب کے تقریباً ایک کرور ۳۳ لاکھ مسلمان (سید وغیرہ کو چھوڑ کر) ہندستانی آرین (INDO-ARYAN) نسل سے ہیں، جس سے پنجاب کے ہندو اور سکھ ہیں۔ یہ لوگ راجپوت، جاٹ، کھتری وغیرہ ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے اور عہد اسلامی میں اسلام لائے۔ کشمیر اور راجپوتانہ کے کچھ حصے میں بھی ہندستانی آریہ نسل ہی کے لوگ آباد ہیں، اور کشمیر کے ۲۸ لاکھ اور راجپوتانہ کے دس لاکھ مسلمان یا تو پہلے کھتری اور برہمن تھے یا راجپوت۔ صوبہ متوسط سے لیکر راس کماری تک کے (موپلوں کو

چھوڑ کر جو عرب نسل سے ہیں)۔ ایک کرور دس لاکھ مسلمان ڈراویڈی نسب سے ہیں اور وہ اسلام قبول کرنے سے پہلے، تامیل، تلگو اور مرہٹہ وغیرہ تھے۔ پھر یو۔پی کے ۷۷ لاکھ اور بہار کے ۴۲ لاکھ مسلمان (سید وغیرہ کے ماسوا) آرین ڈراویڈی (ARYO-DRAVIDIAN) نسل سے ہیں جو پہلے برہمن، راجپوت اور شدرذاتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ سندھ کے میمن۔ بوہرے اور خوجہ، لوہانہ اور بھاٹیہ ذاتوں سے ہیں۔ سندھ میں عرب نسل کے مسلمان بھی ہیں لیکن ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ سندھ کے زیادہ تر مسلمان سندھ کی پرانی قبائلی ذاتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ آسام کے ۲۷ لاکھ مسلمان یا تو مانگول نسل سے ہیں یا منگول ڈراویڈی۔ ان صوبوں کے مسلمان اب تک اپنی ذات کے ناموں سے پکارے جاتے ہیں۔ پنجاب میں مسلمان جاٹ اور آرائیں وغیرہ اب تک مشہور ہیں۔ یو۔پی میں ملکانہ راجپوت مشہور ہیں۔ سر عبداللہ ہارون (ممبر مجلس عاملہ مسلم لیگ) نے پاکستان کے سلسلے میں دہلی سے ایک بیان دیتے ہوئے کہا تھا:—

> ہندستان کے ۹۰ فیصدی مسلمان اسی سرزمین کے سپوت ہیں اور ان کے آبا و اجداد نے اسلام کے حقایق کو تسلیم کرکے ایمان لایا تھا۔ مسٹر جناح خود بھاٹیا خاندان کے ہیں، سر سکندر حیات خاں راجپوت اور میں لوہانہ خاندان کا ہوں۔
>
> ہندستان میں صرف دس فیصدی مسلمان ایسے ہیں جو عرب، ایرانی یا مغل نسل سے ہیں لیکن یہ دس فیصدی عرب، ایرانی اور مغلوں کی اولاد بھی اس ملک میں ایک ہزار برس کے قیام کے بعد ہندستانی ہو گئی ہے۔
>
> (ہندستان ٹائمز دہلی مورخہ ۵ را پریل ۱۹۴۰ء)

حقیقت یہ ہے کہ ہندستان میں بہت کم مسلمان ایسے ہیں جو نسبی طور پر غیر ہندستانی ہیں۔ ہاں بلوچستان کے بلوچ، بدوہی پٹھان اور سرحد کے پٹھان غیر ہندستانی نسب کے ہیں۔ جن کی آبادی ملا جلا کر کل ۳۰ لاکھ (بلوچستان ۸ لاکھ اور سرحد ۲۲ لاکھ) ہے۔ افغان ترک اور ایرانی نسلوں سے مرکب ہے جسے (TURKO-IRANIAN) کہتے ہیں۔

بہرحال یہ امر مسلّم ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کے درمیان کسی طرح کا نسلی اشتراک
نہیں بلکہ اس کے برعکس ہندو اور مسلمانوں کے درمیان یہ اشتراک موجود ہے۔ ۹۵ فیصدی
یا بقول سر عبداللہ ہارون ۹۰ فیصدی مسلمان انھیں نسلوں سے ہیں جن سے ہندو ہیں۔ لہذا
یہ ایک ایسا قوی رشتہ ہے جو مسلمانوں کے درمیان تو مشترک نہیں لیکن ہندوؤں اور
مسلمانوں کے مابین مشترک ہے۔

ہندو مسلمانوں کی مشترک تاریخ

یہ حقیقت بھی آئینہ کی طرح عیاں ہے کہ ہندستان
کے مسلمانوں اور ہندوؤں کا گذشتہ ایک ہزار برس سے
تاریخی اشتراک موجود ہے اور ہندو اور مسلمان اس وقت اضطراری طور پر اس ملک میں یکجا
جمع نہیں بلکہ صدیوں سے وہ اسی سرزمین پر ایک دوسرے سے جملہ قسم کے رابطہ، جو
انسانوں کے درمیان ہو سکتے ہیں، رکھتے ہوئے بستے چلے آرہے ہیں۔ موجودہ ہندو مسلم قوم
کی ترتیب و تدوین تاریخ کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ موجودہ ہندستانی
قوم ایک دوسرے کے امتزاج اور ترکیب ہی سے بنی ہے۔ دونوں فرقوں نے اس
ایک ہزار برس میں ایک دوسرے پر ایسا اثر ڈالا ہے کہ اب ہم پہچانے بھی نہیں جاتے۔
ہمارے لباس اور ہماری پرانی وضع و قطع کسی عجائب خانہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ہمارے
جسموں پر نہیں۔ مذہب کے سوا ہماری زندگی کے تمام لوازمات اور عادات و اطوار بدل
گئے۔ ہماری شکل و صورت، بول چال، تراش خراش، وضع قطع، ہمارا اُٹھنا، بیٹھنا، چلنا،
پھرنا، کھانا پینا سب بدل گیا۔ ہماری موجودہ معاشرت ہمارے ایک ہزار سالہ میل جول
کی چغلی کھاتی ہے۔ یہ چیزیں جادو کا ڈنڈا گھما دینے سے ایک لمحے میں پیدا نہیں ہو سکتیں۔
ان کے لئے صدیاں درکار ہوتی ہیں۔ اگر اب ہمیں عرب، ایران، یا ترکستان کے
مسلمانوں سے ملایا جائے تو ہم کسی طرح اُن سے نہیں ملتے۔ سوائے مذہب کے ہمارے
اور ان کے درمیان کوئی شئے مشترک نہیں۔ جس طرح پہاڑ کی چوٹی سے ایک سنگ ریزہ
ہزاروں برس تک دریائی لہروں کی ٹکریں کھانے کے بعد اپنی شکل و شباہت بدل دیتا ہے،

اسی طرح زمانے نے ہمیں اِس ماحول میں کچھ کا کچھ کر دیا ہے۔

ایک ہزار برس سے ہماری قسمتیں ایک ہیں۔ تمام آفات ارضی وسماوی کا ہم نے متحد ہو کر مقابلہ کیا ہے۔ ہمارے گذشتہ اتحاد کی چھاپ ہماری زندگی کے ہر پہلو پر نظر آتی ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت ہماری اِن تاریخی یادگاروں کو محو نہیں کر سکتی، جس کا اثر ہماری ہر ادا میں موجود ہے۔ اور ہمارے انکار سے بھی تاریخ اور زمانے کا یہ اٹل فیصلہ بدل نہیں سکتا۔ ہماری مرضی کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ قومیت کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ اس کی ترتیب اضطراری طور پر نہیں بلکہ تاریخ کے ذریعہ ہوئی ہو۔ یہ تقاضا ہم ہندستان کے باشندے بدرجۂ اتم پورا کرتے ہیں، اسلئے ہم پر "قوم" کی یہ تعریف بھی صادق آتی ہے۔

اقتصادی یکجہتی

جہانتک اقتصادی ومعیشی اشتراک کا تعلق ہے یہ بھی صدیوں سے قائم ہے ہندستان کے لہلہاتے ہوئے کھیت، اُس کی پیداوار، زمین کے نیچے دبی ہوئی معدنیات، سونا، چاندی، اس کے پہاڑ، دریا، جنگل، یہ سب ہندو اور مسلمان دونوں کی مشترکہ ملکیت ہیں۔ اس سرزمین کے کونے کونے اور گوشے گوشے میں مسلمانوں کی ملکیتیں اسی طرح ہیں جس طرح ہندو یا کسی اور ہندستانی فرقے کی۔ ہندستان نے جب سُکھ آرام کے دن دیکھے تو ہم سب اس میں شریک رہے اور جب اس پر تباہی وبربادی کے دن آئے تو ہم دونوں کو بھگتنا پڑا۔ جب ہندستان صنعت وحرفت میں دنیا میں شہرت رکھتا تھا، تو ہندو مسلمان سب خوشحال تھے، پھر یورپ نے جب ہماری صنعتوں کو برباد کر ڈالا اور ہماری دولت لوٹ لی تو ہم دونوں مفلوک الحال اور نان شبینہ کو محتاج ہو گئے۔ غرضیکہ ملک کے ہر اقتصادی مدوجزر نے ہم پر یکساں اثر ڈالا۔

اقتصادی معاملات میں ہماری زندگی کے تمام مسائل اور عزائم ایک ہی ہیں، جہد للبقا کی ہر منزل پر ہمارا اور برادران وطن کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہمارے ۳۶۰ دنوں کی کوششوں اور تگ ودو کا صرف ایک مقصد ہے۔ یعنی ملک کی ترقی وخوشحالی۔ ہندو اور مسلمان ایک ساتھ مل کر کھیتی کرتے ہیں، مزدوری کرتے ہیں، نوکریاں، زمینداری، مہاجنی، تجارت،

سب کچھ کرتے ہیں۔ہماری پیداوار کی ایک ہی قدر وقیمت ہے اور ہماری محنت اور مزدوری ایک ہی کانٹے میں تولی جاتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ہندوؤں میں سرمایہ دار زیادہ ہیں۔لیکن ہندو سرمایہ دار کسی ہندو مزدور کے ساتھ اس کے ہندو ہونے کے سبب کوئی رعایت نہیں کرتا اور اسی طرح مسلمان زمیندار یا سرمایہ دار اپنے مسلمان مزدور یا کسان سے کسی طرح کی رعایت نہیں کرتا۔ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کے سرمایہ دار اور زمیندار مل جل کر اپنی ہندو مسلم رعیت اور مزدوروں کا خون چوستے ہیں، ان پر ظلم کرتے ہیں اور پھر دونوں متحد ہو کر ان کے مقابل اپنے مفاد کی حفاظت کرتے ہیں۔مالگذاری کی زیادتی سے ہندو اور مسلم کاشتکار سب بے چین ہیں اور مزدوری کی کم شرح کے سبب دونوں فرقوں کے مزدور بدحال و پریشان ہیں یہ تو طبقاتی مفاد ہیں اس سے کسی ذات یا فرقے کا تعلق نہیں۔

غرضیکہ ہندستان کے تمام باشندے ایک اقتصادی فرقے اور معیشی خاندان کی طرح ہیں جو ایک ناقابل شکست بندھن میں بندھا ہوا ہے۔وہ اقتصادی اشتراک، جو قومیت کی تعمیر کرتا ہے، ہندستان کے مختلف فرقوں میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

سیاسی اشتراک کے متعلق مجھے کچھ کہنا نہیں صرف اس قدر اشارہ کافی ہے کہ محمد غوری کے عہد حکومت سے لیکر اس وقت تک بغیر کسی وقفے کے، ہندو اور مسلمانوں کے مابین سیاسی اشتراک رہا ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس زمانے میں ہندستان پر مسلمانوں کی بادشاہت رہی اور ہندو غلام رہے۔حقیقت یہ ہے کہ بادشاہت سارے مسلمانوں کی نہیں بلکہ ایک مسلمان خاندان کی تھی، اور ہندو اور مسلمان دونوں ہی غلام تھے، بالکل اسی طرح جس طرح انگریزوں کے غلام ہیں یا نظام حیدر آباد کے۔بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ عہد اسلامی میں بھی مسلم حکمرانوں کے ساتھ کاروبار حکومت میں ہندوؤں کی کافی شرکت رہی ہے۔بڑے بڑے عمال حکومت، ہندو رہے ہیں اور یہاں تک کہ لائق اور باصلاحیت ہندوؤں کو وزیر مال اور سپہ سالاری تک کا عہدہ ملا ہے۔ہندوؤں میں لالہ اور دیوان کی ذاتیں اب تک موجود ہیں۔جن کے آباؤاجداد صدیوں تک ان خاندانوں کی حکومتیں چلانے میں مدد دیتے رہے۔

یہ کہنا بھی صحیح نہ ہوگا کہ یہ ہندو عمال حکومت کی مثال ایسی ہے جیسی موجودہ زمانے میں برٹش حکومت

کے ہندستانی عمال کی۔ یہ مثال بالکل غلط ہے۔ مسلمان حکمران بدیسی حاکم نہ تھے جنھوں نے اپنی تجارت یا حکومت کی توسیع کیلئے ہندستان کو نوآبادی بنایا تھا، بلکہ وہ ہندستانی تھے۔ ہندستان کو اُنھوں نے اپنا گھر بنالیا تھا۔ ان کی حکومت کو کسی طرح غیر ملکی حکومت نہیں کہا جاسکتا۔ گرچہ وہ حکومت قومی نہ تھی بلکہ شخصی تھی اور اس میں قوم کی خواہش یا اس کی رائے کو کوئی دخل نہ تھا۔ لیکن ہم اُسے اسی طرح ہندستانی حکومت کہہ سکتے ہیں جس طرح چندر گپت یا اشوک کی حکومت کو۔

اس کے بعد تقریباً دوسَو سال سے انگریزی عہد حکومت میں ہمارا سیاسی اشتراک (یا غلامی) ہے۔ اس حکومت کی ایک ایک پالیسی اس کا ایک ایک قانون اور ایک ایک عمل ہندو اور مسلمان دونوں پر یکساں طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔

غرضیکہ ہم دونوں ایک واحد سیاسی ڈوری میں بندھے ہوئے ہیں۔ ہماری قسمت ایک ہے اور اس کا فیصلہ مشترک۔ ہم ایک ہی سیاسی ماحول میں پلے ہیں۔ ہماری سیاسی تربیت بھی ایک ہی جیسی ہے۔ موجودہ سیاسی شعور جو یورپ کا پیدا کردہ ہے، اس میں بھی ہم دونوں برابر کے حصہ دار ہیں۔ اسمبلی کانسل، ڈسٹرکٹ بورڈ، میونسپلٹی اور دوسرے جمہوری ادارے ہم مل جل کر چلاتے ہیں اور ہندو مسلمان مل کر وزارتیں بناتے اور حکومت کرتے ہیں۔

زبان کے متعلق کلچر کے عنوان کے تحت بات چیت ہوگی، اس لئے یہاں اس پر بحث نہیں کیجاتی۔ فی الحال ہم یہاں تک پہنچے ہیں کہ ہندستان کی جملہ ملتوں کا وطن، تاریخ، معاشی اغراض و سیاست صدیوں سے متحد و مشترک رہی ہے اور ہے۔ اور ان امور کے لحاظ سے ہندستان کے تمام فرقے اور ملتیں ایک قوم ہیں۔

آگے ہمیں اس امر کا مطالعہ کرنا ہے کہ تمدنی اور ثقافتی لحاظ سے ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں یا نہیں۔

مسلمانوں اور ہندوؤں کا مشترک تمدّن

ایکہزار برس کے ارتباط واشتراک کے غیر فانی نتائج

ان دنوں اسلامی کلچر اور اسلامی تمدن کے نعرے بڑی بلند آہنگی کے ساتھ لگائے جاتے ہیں اور تحریک پاکستان کا سب سے بڑا محرک یہی نظریہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کا ایک جداگانہ کلچر ہے، وہ ایک علٰحدہ ثقافتی وجود (CULTURAL ENTITY) ہیں اور اپنے کلچر اور تمدن کو ہندو تہذیب میں مدغم ہونے سے بچانے اور اس کی حفاظت کیلئے انھیں ہندؤں سے علٰحدہ رہنا چاہئیے۔ ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ ان کی جو تہذیب ہے وہ اسلامی تہذیب ہے۔

موجودہ دور میں، کلچر کے لفظ نے جو وسعت اختیار کرلی ہے، اس کے پیش نظر اس کا مفہوم متعین کرنا بہت مشکل امر ہے۔ اسلئے قدرتی طور پر مذہب، بھی اس کے اندر آگیا ہے۔ ہمارے ملک کے چند مسلم مفکرین کا تو خیال ہے کہ مذہب ہی کلچر ہے۔ اس سلسلے میں "اسلامی کلچر" کا لفظ بہت چل گیا ہے۔ لیکن کلچر میں مذہب یقینی شامل نہیں، مختلف المذاہب قوموں کا ایک کلچر ہوسکتا ہے۔ مثلاً انگلستان کے یہودی اور نصرانیوں کا ایک کلچر ہے۔ چینی مسلمانوں، بودھوں اور عیسائیوں کا بھی کلچر تقریباً ایک جیسا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ موجودہ زمانہ میں مذہبی یا نسلی کلچر نہیں ہوتا بلکہ قومی کلچر ہوتا ہے۔ لیکن اگر اسلامی کلچر یا کرسچین کلچر، کا فقرہ زبان سے ادا کیا جاتا ہے تو اس کے معنی اتنے وسیع ہوجاتے ہیں کہ کوئی صاف چیز ذہن میں نہیں آتی۔ کیونکہ اگر ہم اسلامی کلچر یا کرسچین کلچر مان لیتے ہیں تو پھر اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ افغانستان، مصر، ہندستان، چین، جاوا، ترکی، ایران ان تمام مسلم ممالک کا ایک واحد کلچر ہے۔ یا اسی طرح دنیا کے تمام عیسائی ممالک واحد کلچر کے مالک ہیں۔ حالانکہ یہ حقیقت نہیں۔ ہر ملک کا علٰحدہ علٰحدہ کلچر اور اس کی ایک جُدا تہذیب ہے۔ اسلامی تہذیب کے تو کوئی معنی پیدا نہیں ہوتے کیونکہ یہ کسی قوم اور کسی زمانے کی تہذیب نہیں رہی اور اس کے ہمہ گیر دائرے میں اس قدر مختلف المعاشرت اور مختلف المزاج قومیں آئیں کہ اس کے خصوصیات کے نشانات بتانا مشکل ہے۔ اگر اسلامی کلچر سے مراد نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ہے تو بیشک یہ کہا جاسکتا ہے کہ تمام مسلمانوں کا ایک کلچر ہے۔ ورنہ اگر کلچر سے مراد ادب، معاشرت، رسم رسومات، موسیقی، مصوری وغیرہ ہے تو یقینی مسلمانوں کا کلچر

ایک نہیں۔ ممکن ہے کچھ لوگ عرب کے کلچر کو اسلامی کلچر مانتے ہوں۔ لیکن عرب (یا حضرت رسول صلعم کے زمانے کے عرب) کا کلچر موجودہ زمانے میں یقینی کسی اسلامی ملک کا کلچر نہیں۔ علاوہ اس کے تہذیب (کلچر) کوئی منجمد اور ٹھوس چیز نہیں اور اس کی شکل ہمیشہ ایک سی نہیں رہ سکتی۔ ہر زمانہ میں اس کی شکل و صورت میں تبدیلی ہوتی رہی۔ ترکی یا ایران کا جو تمدن ایک ہزار سال قبل تھا وہ اب نہیں رہا۔ ہندستان کے کلچر میں انگریزوں کے آنے کے بعد جو بے پناہ تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ آنکھوں کے سامنے ہیں۔

اِس لئے یہ بتلانا بہت دشوار ہے کہ کس قوم کے اور کس زمانے کے تمدن کو اسلامی، تمدن کہا جا سکتا ہے۔

الغرض تمدن کو مذہب سے جدا کرکے سوچا جائے تو یہ دقت نہ پیدا ہوگی اور اس کا مفہوم صاف صاف سامنے آجائے گا۔ لیکن اس سلسلے میں تمدن کی نشو و نما میں مذہب کی تاریخی حیثیت نظر انداز نہیں کی جا سکتی اور تہذیبوں کی تشکیل و تدوین میں اس نے جو اہم حصّہ لیا ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ تمدن کے بنیادی نظریے اور محرکات ابتدائی زمانے میں مذہب ہی نے فراہم کئے۔ ہر مذہب نے زندگی کے الگ الگ نظریے پیش کئے اور انھیں نظریوں کے تحت مختلف تمدنوں کی ساخت و پرداخت کا کام ہوا۔

کلچر نام ہے رسم و رواج، آدابِ معاشرت، زبان، ادب، شعر و شاعری، مصوری، موسیقی، سنگ تراشی، طرزِ تعمیر وغیرہ کا۔ لیکن زندگی کے ان تمام پہلوؤں کی ارتقاء چند اصولوں اور نظریوں کے ماتحت ہوتی ہے۔ زندگی کے متعلق جس قوم کا جتنا زیادہ وسیع نظریہ ہوتا ہے۔ اسی تناسب سے اس کی تہذیب کا معیار بلند یا پست ہوتا ہے۔ ایک معیاری کلچر کی پیدائش کیلئے ایک قوم کا متعین تصور زندگی (OUT LOOK ON LIFE) بہت ضروری ہے۔ زندگی سے متعلق اس کے جیسے تصورات ہوں گے۔ اُسی روشنی میں اس کا سارا کلچر ڈھلے گا اور انھیں بنیادی تصورات کے ماتحت اس قوم کی ذہنی و دماغی تربیت ہوگی۔ پچھلے زمانہ میں ان تصوراتِ زندگی کا سرچشمہ مذہب ہی تھا۔ اس لئے یہ امر مسلّم ہے کہ ابتدا میں مذہب ہی نے تمدن و تہذیب کے اُصول فراہم کئے۔ یہاں ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ مذہب نے انسان کو کیا تصوراتِ زندگی دئے۔ ہمارا خیال ہے کہ سزا و جزا اور زندگی مابعد الموت کو چھوڑ کر اگر تمام مذاہب کے تصورات و نظریاتِ زندگی کا جائزہ لیا جائے تو ان میں کچھ زیادہ فرق نظر نہ آئیگا تمام مذاہب نے

کسی نہ کسی پروردگار کی پرستش کی تعلیم دی ہے، جھوٹ، چوری، زنا، ظلم و ستم اور لہو و لعب کو منع کیا ہے اور رحم، بردباری، حلم، عفو، عدل و انصاف، نیکی، انسانی شرافت وغیرہ کی تعلیم دی ہے۔ پھر تمام مذاہب انسان کی نجات پر بھی متفق ہیں، گرچہ اس کے طریقے جُدا جُدا ہیں۔ لہذا ان مماثل تصورات زندگی کے ماتحت جو تمدن ارتقا پائیگا اس میں بہت حد تک یکسانیت لازمی ہوگی۔ یہی سبب ہے کہ آج دنیا کے ہر متمدن ملک کے اخلاقی قوانین ایک سے دکھائی دیتے ہیں اور دنیا کی ہر زبان کا ادب انسان میں انہی شریفانہ خصائل کے پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

لیکن اس یکسانیت کے باوجود ہر مذہب کی کچھ نہ کچھ خصوصیت یقینی رہی ہے اور انسانی ترقی میں اسکا کچھ نہ کچھ چندہ رہا ہے۔ چنانچہ مذہب اسلام بھی، وسیع اخلاقی نظریوں میں دوسرے مذاہب سے مماثل ہونے کے باوجود چند اہم خصوصیات کا حامل ہے اور اُس نے دنیا کی تہذیب میں ایک بڑا چندہ دیا ہے۔ مذہب اسلام نے انسان کو وہ چیزیں دیں جن کا دنیا میں اُس وقت فقدان تھا۔ فطرتِ انسانی کی سربلندی، آزادی، مساوات، صداقت، رواداری، محبت، میانہ روی، خدمت خلق، ہر ماحول پر منطبق ہوجانے کی صلاحیت اور شجاعت وغیرہ یہ تھیں وہ خصوصیات جو اسلام نے اپنے پیروؤں کو دیں۔ لہذا ان خصائل کے ماتحت جو کلچر نشو ونما پائیگا وہ یقینی دوسروں سے مختلف اور اچھوتا ہوگا۔

اسلام نے کبھی نرالے اور انوکھے بننے کی کوشش نہ کی بلکہ اپنے تمام اُصول فطرتِ انسانی پر رکھے یا دوسرے معنوں میں عقل کو اپنا بنیادی پتھر بنایا۔ عقل سے جتنا کام اسلام نے لیا، شاید ہی دنیا کے کسی مذہب نے لیا ہو۔ اس نے ہر قانون اور اُصول کی بنیاد عقلیت پر رکھی۔ اسلام کا دشمن بھی، اسلام میں بہت کم ایسے احکام بتا سکتا ہے جو مافوق الفطرت ہوں یا جو عقل میں نہ سما سکتے ہوں۔ غرضیکہ اُس نے چند اُصول بنائے اور انھیں اپنے پیروؤں کے سامنے رکھدیا اور پھر انسانی عقل کو رہبری کیلئے چھوڑ دیا تاکہ حالات کے مطابق اپنے کو ڈھال لیں۔ اسی لئے مسلمانوں میں اجنبی سے اجنبی ماحول پر منطبق ہوجانے کی عظیم الشان صلاحیت موجود تھی۔ وہ جس سرزمین پر پہنچتے اُس کی فضا میں اس طرح رچ بس جاتے کہ انھیں اجنبی کہنا دشوار ہوجاتا۔ مغل قوم کا ایک مسلمان شہنشاہ اکبر تیسری ہی پشت میں بالکل ہندستانی ہوگیا، لیکن یورپین قومیں ہندستان میں دو سو برس رہنے کے بعد بھی اب تک یورپین ہی ہیں یہی سبب ہے کہ مسلمان اس قدر سرعت سے ساری دنیا پر چھا گئے۔

میانہ روی اور اعتدال پسندی کی تعلیم بھی دنیا کو اسی مذہب نے دی۔ اگر اسلام میں میانہ روی اور لچک نہ ہوتی تو یہ دوسرے غیر فطری مذاہب کی طرح کب کا فنا ہوا ہوتا۔ لیکن اسلام آج بھی ایک حقیقت ہے۔ وہ آگ میں تپنے کے بعد بھی کندن ہے۔ دوسرے مذاہب کے برخلاف جو صرف ایک ماحول اور ایک ہی قسم کے حالات میں زندہ رہ سکتے ہیں، اسلام ہر ماحول اور ہر قسم کے حالات میں بڑھ سکتا ہے۔ جب تک اس میں یہ لچک موجود ہے، اس کے فنا ہونے کا کوئی اندیشہ لاحق نہیں ہو سکتا، اور کوئی اسلامستان بنانے کی ضرورت نہیں ہو سکتی۔

اسلام نے علم سے کبھی گریز نہ کیا۔ کتنے مذاہب ہیں جو علم کی آنچ برداشت نہیں کر سکتے لیکن اسلام ہمیشہ علم کو دعوتِ مناظرہ دیتا رہا۔ بلکہ اس نے خود ایک زبردست علمی ماحول پیدا کیا۔ اور اس کے ہر پہلو پر یہاں تک کہ مسئلہ توحید پر بھی آزادی سے رائے زنی کا حق دیدیا۔ بغداد اور ہسپانیہ کے خلفاء کے وقت میں کیسے کیسے مجتہد پیدا ہوئے اور کیسے کیسے علمی مباحث رہے۔ اس زمانے میں مذہب پر اس آزادی سے رائے زنی ہوئی کہ اگر ان مجتہدین اور اماموں کے خیالات اس وقت ظاہر کئے جائیں تو کفر کا فتویٰ ہی مل جائے۔ لیکن اسلام اس اجتہاد سے کمزور نہ ہوا بلکہ اس میں مضبوطی ہی آئی۔ اسلام نے کبھی تنگ نظری نہیں سکھائی اور علم سیکھنے کو منع نہ کیا۔ آج یورپ بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوا کہ علم میں عرب اُن کا اُستادِ اوّل ہے۔ اسلام نے علم ہی کو اصل ترقی کی راہ سمجھا اور اُس کے حصول اور پھیلانے میں کسی طرح کی عصبیت کو راہ نہ دی اور کہیں کافر و مومن کا سوال نہ اُٹھایا۔ دونوں ہاتھوں سے علم کی دولت لٹائی اور یہ نہ دیکھا کہ کون لوٹتا ہے۔ غرضیکہ اسلام نے علم حاصل کرنا ہر مسلمان کا فرض ٹھہرایا۔

رواداری اور اخلاق کی بھی دنیا میں شاید ہی اُس وقت کوئی ایسی مثال مل سکے جو اسلام نے پیش کی۔ اسلام نے نفرت کی تعلیم نہ دی۔ دنیا کی مردود بارگاہ نسل یعنی یہود کو بھی جسے دنیا کی کوئی قوم اپنے ساتھ رکھنا پسند نہ کرتی تھی (اور نہ اب کرتی ہے) اسلام نے گلے لگایا۔ محمود غزنوی ہندستان پر چڑھائی کرتے ہیں اور جیسا کہ کہا جاتا ہے بُت شکنی کیلئے حملہ آور ہوتے ہیں لیکن ان کی فوج کا ایک حصہ کفار پر مشتمل ہوتا ہے۔

رواداری کی تو انتہا ہے کہ تین خداؤں کے قائل عیسائیوں سے سلسلۂ ازدواج قائم کرنے کی اجازت دی گئی۔

الغرض یہ وہ صفات تھے جو اسلامی کلچر کی جان تھے اور یہی وہ اُصول تھے جن کی عینک سے مسلمان زندگی کو دیکھتے تھے لیکن اب کیا نقشہ ہے مسلمانوں نے مساوات، اعتدال، شجاعت، بہادری، رواداری، صداقت سب کھو دی۔ آج ایک ہزار سال ہندستان میں رہنے کے بعد بھی وہ اس خوف سے ہراساں ہیں کہ ہندو ماحول میں ہم نہیں

جی سکتے تنگدلی کا یہ عالم ہے کہ ہندو فلسفہ، ہندو ادب اور روایات سے مسلمانوں کو نفرت ہے لیکن ہمارے آباؤ اجداد نے فاتح اور حکمراں ہونے کے باوجود اپنے مفتوح کے کلچر سے نفرت نہ کی بلکہ اسے اپنے سر کا تاج بنایا۔ آج مسلمان علم کی آنچ سے بھاگتے ہیں۔ وہ دنیا کے تمام موجودہ سیاسی و عمرانی نظریوں پر غور و فکر کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ یہ تو سوشلزم ہے، یہ تو کمیونزم ہے، یہ دہریت ہے، یہ الحاد ہے، یہ کفر ہے اور یہ شرک ہے۔ غرضیکہ ہر ترقی سے بھاگنے کیلئے ایک نام رکھ چھوڑا ہے۔ دنیا میں پھیلنے کا اب انھوں نے یہ طریقہ نکالا ہے کہ مسلمانوں کیلئے الگ ایک ڈربہ بنانا چاہتے ہیں اور علم سیکھنے کی کیا ضرورت ہے سارا علم قرآن میں بند ہے اور قرآن جزدان میں۔ رواداری جو اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت تھی ہم میں اتنی بھی نہ رہی کہ فریق کی بات تو ٹھنڈے دل سے سُن لیں اور شجاعت بہادری کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ آٹھ کرور فرزندانِ توحید کو اقلیت کہہ کر اُنھیں دوسری قوموں سے ڈرایا جا رہا ہے اور علیحدگی اور ہجرت کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ اگر اسلام نے علیحدگی کی تعلیم دی ہوتی تو آج دنیا میں ۴۰ کرور مسلمان نہ ہوتے۔

اسلامی تہذیب اور ہندو تہذیب کی کشمکش

غرضیکہ شرافت اور انسانیت کے اِن بلند نظریوں کے ساتھ مسلمان ہندستان میں آئے۔ فی الحقیقت ہندو اور مسلمان دو مختلف بلکہ متضاد تہذیبوں کے مالک تھے۔ پہلے تو ان دونوں تہذیبوں میں خوب خوب ٹکریں ہوئیں۔ اسلامی تہذیب ایک نئی تہذیب تھی اس میں شباب کا سا زور اور بلا کا جوش تھا۔ اس کی بنیاد انسانی برابری اور رواداری پر تھی۔ اس کا مقابلہ پرانے اور بوسیدہ ہندو تمدن سے آپڑا۔ اس کشمکش میں ہندو تہذیب ڈھیلی پڑی اور اُس نے اسلامی تہذیب کو جگہ دینا شروع کیا لیکن دوسری طرف رفتہ رفتہ ہندو تہذیب کا فلسفیانہ ماحول مسلم تہذیب پر چھانے لگا۔ ابتدا میں یہ دونوں تہذیبیں اپنے اپنے راستے چلتی رہیں اور گنگا و جمنا کے دھاروں کی طرح الگ الگ بہتی رہیں لیکن پھر دونوں ایک سنگم میں مل گئیں۔ اِن دونوں تہذیبوں کا مِلاپ دنیا کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ تھا۔ اسی تاریخ سے جدید ہندستان کے ڈھلنے کا کام شروع ہو گیا۔ مسلمان جو دولت اپنے ساتھ لائے تھے وہ مادرِ وطن کے قدموں میں رکھ دی اور ماں نے بھی اپنے نئے سپوت کو گلے لگا کر اس پر اپنے تمام خزانے کھول دئے۔ پھر تو ان دونوں تہذیبوں کے امتزاج اور ترکیب سے ایسے ایسے نقش و نگار بنے کہ ساری دنیا دنگ رہ گئی۔

علمائے اسلام کی ہندو تہذیب سے دلچسپی

ابتدا ہی سے مسلمان علماء، صوفیائے کرام اور شعراء نے ہندو فلسفے اور ادب سے گہری دلچسپی لینی شروع کی۔ امیر محمود

کے ساتھ البیرونی جیسے جید عالم اور مصنف بھی ہندستان آئے۔ اُن کا ہندستان آنا ایک تاریخی واقعہ ہے۔ محمود غزنوی سے ہندو قوم کو جتنی شکایات ہیں انھیں صرف ایک البیرونی کی خدمات نے دھو دیا ہے۔ البیرونی ہی وہ شخص ہے جس نے ہندستان کے علم و فن کو مغربی دنیا سے روشناس کرایا۔ البیرونی تیرہ[۱۳] سال ہندستان میں رہا اور پنڈتوں سے سنسکرت پڑھی۔ اُس وقت کے برہمن اس درجہ متعصب تھے کہ وہ ایک "ملیچھ" کو سنسکرت پڑھانا پاپ سمجھتے تھے۔ لیکن اس قلیل مدت میں البیرونی نے بڑی محنت و جانفشانی سے سنسکرت کی بیس[۲۰] نادر الوجود کتابوں کا عربی میں ترجمہ کر ڈالا۔ اتنا ہی نہیں اس نے عربی کی کتابوں کا سنسکرت میں بھی ترجمہ کیا۔ اس طرح البیرونی کی مساعی سے مشرق و مغرب کے بیچ افہام و تفہیم کا ایک دروازہ کھل گیا۔

اس کے بعد علماء اسلام نے ہندو فلسفے اور ادب کا مطالعہ اور تصنیف و تالیف اپنا مقصد بنا لیا۔ ابو الفرج رونی اور مسعود سعد سلمان، عہد غزنویہ کے بلند پایہ شعراء تھے۔ ان دونوں نے برج بھاشا میں اپنے دیوان چھوڑے ہیں۔ انھوں نے بھاشا میں فارسی کے الفاظ بھی ملائے۔

یہ دلچسپی یک طرفہ نہ تھی۔ ہندو پنڈت اور شعراء نے بھی فارسی زبان میں دلچسپی لینی شروع کی۔ پرتھوی راج کے درباری شاعر چند بردائی کے کلام میں کافی فارسی الفاظ پائے جاتے ہیں۔ شاہ شرف الدین یحییٰ منیری (عہد خلجیہ) نے بھاشا میں شاعری کی۔ ابراہیم عادل شاہ، محمد شاہ (گولکنڈہ ۱۶۲۵ء) اور ابو الحسن تانا شاہ وغیرہ دکنی زبان کے نامی شعراء ہوئے۔ ہندو فلسفے اور ادب میں عبد الرحیم خانخاناں ایک بڑے مرتبے کے مالک ہیں۔ آپ نے سنسکرت کی متعدد کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ رحیم۔ اور تلسی داس جو ہمعصر اور ہندی کے ہم پلہ شعراء تھے دونوں میں بڑی الفت و محبت تھی۔ امیر خسرو نے ہندو مذہب اور فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا، اور بھاشا کا بے نظیر کلام چھوڑا۔ ابو الفضل، فیضی، اور نقیب خاں کی سنسکرت دانی مشہور ہے۔ موخر الذکر ہی نے مہابھارت کا ترجمہ ایرانی زبان میں کیا تھا۔ دارا شکوہ کی ہندو علوم سے دلچسپی اور دقیق نظری سب جانتے ہیں۔ اُپنشد کا ترجمہ (سر الاسرار) اسی نے مکمل کیا۔ بھگوت گیتا کو دارا شکوہ ہی نے فارسی کا جامہ پہنایا۔ کبیر تو ہندو رنگ میں ایسے رنگے کہ ہندو انھیں ہندو کہتے تھے اور مسلمان، مسلمان۔ یہ تھا صوفیت کا کمال، اور ہندو مسلم کلچر کی معراج۔ اکبر کے نورتن مشہور ہی ہیں، جو اپنے وقت کے باکمال لوگوں میں منتخب تھے، اور ان میں ہندو مسلمان، سبھی تھے۔

غرضیکہ اسلامی علمار وصوفیا، اور سلاطین سبھوں نے اس نئی مشترک تہذیب کے ڈھالنے میں ہاتھ بٹایا۔ حالانکہ انھیں اس کی حاجت نہ تھی وہ الگ تھلگ رہ کر بھی نہایت شان کے ساتھ حکومت کرسکتے تھے۔ لیکن وہ ترقی کرنیوالے تھے اُنھوں نے نفرت کو اپنے دل میں جگہ نہ دی اور مفتوح کے علم کو بھی سر آنکھوں پر رکھا اور یقینی یہی اسلام کا اصل اُصول ہے۔ لیکن آج مسلمان ایک زبردست احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں۔ وہ سنسکرت یا ہندی پڑھنا ہندوئیت میں مدغم ہوجانا سمجھتے ہیں۔

مشترک زبان کی پیدائش

مسلمانوں کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے ہندستان کو ایک مشترکہ زبان دی۔ اسلام نے انھیں انسانی برتری کا جو سبق پڑھایا تھا اس نے اُن کے دلوں میں عوام کیلئے ایک خاص جگہ پیدا کرلی تھی۔ چنانچہ مسلمان سلاطین نے ہندستان کے عوام الناس سے جو دلچسپی لی، وہ ہندو راجاؤں نے پہلے کبھی نہ لی تھی۔ چنانچہ جنتا کی زبانوں کو کبھی ایسا فروغ حاصل نہ ہوا جو مسلمانوں کے زمانے میں ہوا۔ یہ امر بہت ہی تعجب خیز ہے کہ اُس وقت تک رامائن، مہابھارت، پُران وغیرہ عام زبانوں میں نہ تھے۔ انھیں مسلمانوں ہی نے سنسکرت سے ترجمہ کرکے ہندو عوام تک پہنچایا۔ ایک عامی زبان (برج بھاشا) کو علمی زبان بنا دینا مسلمانوں ہی کا کام تھا۔ یہاں زبان اُردو کی تاریخ پیش کرنے کی گنجایش نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ زبان اُردو کی پیدائش اور اس کی ترقی میں، کس طرح ہندو مسلمان دونوں نے یکساں طور پر حصّہ لیا ہے۔ سیکڑوں مسلمان اور ہندو بزرگ گنائے جاسکتے ہیں جنھوں نے اِس پودے کی آبیاری کی اور اسے پروان چڑھایا۔ اس کی زمین اور قواعد (گرامر) بھاشا کی ہے، اور ایرانی وعربی الفاظ کے گل بُوٹے جڑے ہوتے ہیں۔ یہ ہماری تہذیب کی سب سے بڑی یادگار ہے اور ہمارے ایک ہزار برس کے اتحاد کی نشانی۔

یہ زبان آج تک سارے ہندستان کے لسانی اشتراک کا ذریعہ بنی ہوئی ہے اور صوبائی زبانوں کے علاوہ اگر کوئی زبان اکثر قطعۂ ملک میں سمجھی جاتی ہے تو وہ یہی زبانِ اُردو ہے۔ مشرقی ہندستان، اور بمبئی، کراچی، منگلور، مدراس، (شہر) میں اِس کے بولنے والے اور سمجھنے والوں کی تعداد ۱۰ کروڑ ہے۔ اسے اُردو کہا جائے یا ہندی، یا ہندستانی، اصل میں یہ ایک ہی زبان ہے۔ جسے ہندو اور مسلمان دونوں بولتے ہیں۔ یہ کہنا کہ یہ کسی ایک فرقے کی زبان ہے سراسر غلط ہے۔

علوم وفنون کی ترقی

ہندوستان میں تاریخ نگاری مسلمانوں کے آنے سے پہلے بالکل مفقود تھی
پُرانے ہندو راجاؤں کی تاریخ قصّے کہانیوں کی صورت میں بیان کیجاتی تھی
جس میں غلط سلط باتیں ملا دیجاتی تھیں۔ لیکن مسلمانوں نے ہندستان میں تاریخ اور سیرت نگاری کا ایک فن قائم کر دیا۔ عہدِ اسلامی کی چند تاریخیں اور سیرِ عالمگیر شہرت کی مالک ہیں۔ بابر اور جہانگیر کی تزکیں دُنیا کے سرمایۂ سِیَر میں داخل ہیں۔ اور فرشتہ اور خافی خاں کی تاریخیں مشہور عالم ہیں۔
تصوف وہ دولت تھی جو اسلامی تہذیب کو ایران سے ملی اور جسے مسلمان اپنے ساتھ ہندستان لائے۔

سچ تو یہ ہے کہ ہندستان میں اسلام صوفیوں ہی نے پھیلایا۔ خواجہ معین الدین چشتی نے اسلامی تبلیغ و اشاعت کیلئے اُس مقام کو چُنا جو راجپوت کلچر کا مرکز تھا۔ ملک محمد جائسی نے (۱۵۴۰ء) بھاشا کی مشہور کتاب 'پدماوتی' لکھی، جو تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اکبر کی انتہائی رواداری اور ہندو تہذیب سے عشق، حضرت شیخ سلیم چشتی (فتح پور سیکری) جیسے باکمال صوفی کے زیر اثر تھا۔ عثمان شاہ اور نور محمد شاہ نے برج بھاشا میں قصّے کہانیوں کے پیرائے میں صوفیانہ عقائد کی اشاعت کی۔ اسلامی تصوف اور ہندو فلسفے کے میل جول سے جو تصوف پیدا ہوا اُس کی پیداوار امیر خسرو، کبیر، گرونانک اکبر، اور داراشکوہ کی شخصیتیں ہیں۔
فلسفہ، ریاضی، ہیئت، نجوم اور طب کا جو ذخیرہ ہندستان کے پاس تھا۔ وہ عربی اور فارسی میں منتقل ہو کر مسلمانوں کے پاس پہنچا، اور پھر اُس کے برعکس مسلمان جو کچھ اپنے ساتھ لائے تھے اسے سنسکرت اور عام زبانوں میں منتقل کر کے ہندستان کو دیا۔ مشاعرے کی رسم مسلمانوں ہی کی ایجاد ہے، جس کے ڈھنگ پر آج کل کوی سمیلن ہوا کرتے ہیں۔ ہندستان میں مسلمانوں کے آنے سے قبل کبھی کوئی سمیلن نہ ہوا۔

مذہبی عقائد اور معاشرت پر اثر

ہندو اور مسلمانوں کے رابطہ نے ان دونوں کے مذہبی عقائد اور معاشرت پر بہت زبردست اثر ڈالا۔
ہندو مذہب میں مساوات کا نام و نشان تک نہ تھا۔ شودر کیساتھ ان کا سلوک بہت ظالمانہ تھا۔ ہندو تہذیب کی بنیاد مختلف نسلوں اور فرق مراتب پر تھی۔ کوئی ہندو راجہ، اپنے کسان رعیت سے مساوات کا سلوک کرنے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ برہمن اور شودر عمرانی مراتب کے دو سروں پر تھے۔ لیکن مسلمانوں میں مساوات اور برابری تھی۔ یہاں ذات اور نسل کی بنا پر کسی طرح کا تفوق نہ تھا۔ یہاں تو غلام بھی

اپنے حسنِ عمل کی بدولت بادشاہ بن جاتے تھے۔ اور اسلامی غلاموں (غلام خاندان) کے وہ دکارنامے ہوئے ہیں جنکی یادگاریں ابتک باقی ہیں۔ یہ چیز ہندستان کیلئے بالکل نئی تھی۔

ہندوؤں میں غیر مذاہب کے لوگوں سے رواداری کا بھی نام ونشان نہ تھا۔ اس میں شبہہ نہیں کہ ہندستان میں کبھی مذہب کے نام پر خونریزیاں ہوئی تھیں لیکن وہ دوسرے مذاہب کے لوگوں اور خاص کر مسلمان اور عیسائیوں کو یقینی نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے اور ملکش سمجھتے تھے۔ ان ملکشوں کیساتھ مل جل کر ایک ملک میں رہنا اور راج پاٹ چلانا اُن کے خواب وخیال میں بھی نہ آیا تھا۔ لیکن اسلام سے روابط ہونیکے بعد ان میں نہ وہ نفرت رہی اور نہ وہ عدم مساوات۔ یہاں تک کہ مسلمان اور ہندوؤں میں شادی بیاہ کے رشتے بھی جاری ہو گئے مذہبی عقیدے میں بھی بہت کچھ سمجھوتہ ہوا۔ ہندستان کیلئے توحید کا تخیل بالکل اجنبی تھا۔ کثیر التعداد معبودوں کی پرستش ہوا کرتی تھی۔ عوام کیلئے مذہب کے دروازے بند تھے، جو پیشوایانِ مذہب ہی کے ذریعہ کھل سکتے تھے۔ لیکن اس کے برخلاف اسلام توحید کا کلمہ لیکر آیا۔ اُن کا دروازہ ہر انسان کیلئے کھُلا ہوا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں سے رابطہ پیدا ہونیکے بعد بُت پرستی اور برہمنیت کو ایک زوردار دھکہ لگا۔ آٹھویں صدی عیسوی سے (جب عرب ہندستان میں آئے) مغلوں کی آمد تک ہندستان میں متعدد مذہبی تحریکیں اٹھیں، اور وہ سب ہی توحید، مساوات، اور رواداری کا جھنڈا لیکر اٹھیں، اور صدیوں کے ٹھکرائے ہوئے انسانوں کو گلے لگایا، انسانی مساوات کا سبق پڑھایا۔ برہمنیت کا قلع قمع کر دیا۔ اور خدا کی محبت اور بندگی کو زندگی کا مقصد ٹھرایا۔ بھگتی، کی اصلاحی تحریک اٹھی۔ بھگتی کے معنی محبت کے ہیں۔ یہ اسلام ہی کے اصول پر پھیلائی گئی ان اصلاحی تحریکوں نے بتلایا کہ عالیشان مندروں اور مورتیوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور نہ شاستر پڑھنے کی ضرورت ہے۔ بس ایک رحمٰن ورحیم کو یاد کرو۔ اور اسی کی بندگی کرو، رامانند، کبیر داؤ دیال اور ملک داس طبقہ عوام میں سے پیدا ہوئے اور مساوات کا پیغام سنانے لگے۔

سترہویں صدی میں جینیوں نے بھی اپنے مذہب کی از سرِ نو تعمیر کی اور ایک فرقے استھانک وتیی کی بناڈالی، جس نے مندر اور مورت کو خیرباد کہدیا۔ کبیر کا بھی ایک فرقہ پیدا ہوگیا۔ جو کبیر پنتھی کے نام سے مشہور ہوا۔ ان کے علاوہ حسینی برہمن خوجہ ستناموں اور چھچو پنتھیوں کا گروہ پیدا ہوا۔ اس سلسلے کا سب سے بڑا کارنامہ سکھ فرقے کا قیام تھا۔ سکھوں کا یہ فرقہ اسلامی اصولوں پر قائم ہوا۔ اِس میں ابتدا میں جوشِ عمل، شجاعت اور قربانی کی وہی لہر پائی جاتی تھی جو آغاز اسلام میں تھی۔ اِن تمام

ابوالصمد، ابوالمنصور، انوپ چتر اور دسونت وغیرہ ہندو مسلمان مصوروں نے مل کر وہ آرٹ پیدا کیا جسے مغل آرٹ کہتے ہیں۔

دوسرے تمدنی روابط

الغرض ہندو مسلمانوں کا تاریخی میل جول زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہوا اور لباس، خوراک، تفریح وغیرہ سب میں تبدیلی ہوئی۔ ہندستانی ناچ اور گانا مسلمان اُمرا کی عام تفریح ہو گئی۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کا اور ہندوؤں نے مسلمانوں کا لباس اختیار کیا۔ شیروانی جو ہندو راجاؤں اور مسلمانوں کا لباس ہے یہ ایرانی عبا کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ چوڑی دار پاجامہ راجپوت کلچر سے تعلق رکھتا ہے جسے مغلوں نے اپنایا اور آج تک متوسط گھرانوں کا لباس ہے۔ انگرکھا مرہٹوں کا قدیم لباس ہے موجودہ صافہ مغل ہے جو مشرقی ہندستان کی جنتا کا لباس ہو گیا ہے۔ عہدِ قدیم میں ہندستان میں پگڑی کا استعمال نہ تھا۔ پیشواز جو ان دنوں طوائفیں پہنتی ہیں، مغل شاہزادیاں پہنا کرتی تھیں۔ ساڑی ہندو عورتوں کا لباس ہے جسے مسلمان عورتوں نے خوب اپنایا۔ مرزئی یا صدری مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ شلوار بالکل مغل ہے۔ پچیسوں قسم کے کپڑے آب رواں، کمخواب، خیمہ، خاصی، مخمل وغیرہ مسلمانوں نے ایجاد کئے۔ اسی طرح پھل، پھول اور غذا میں بھی تبدیلیاں ہوئیں۔ بیلا، چمیلی کے سوا ہندستانی پھول بہت کم تھے۔ گلاب ایران سے ہندستان لایا گیا۔ کشمیر کے شاہی باغات، آگرہ کا رام باغ۔ تلج اور اعتماد الدولہ کے باغات نے جو ایرانی طرز پر لگائے گئے تھے، ہندستان میں جدید چمن بندی کو روشناس کیا۔ ہندستان میں جنگلی آم ہوا کرتے تھے۔ بڑی نسل کے قلمی آم مسلمانوں کی ایجاد ہیں۔ اسی طرح بہت کم ترکاریاں ایسی ہیں جو ہندستانی ہوں۔ پھر تمام عمدہ عمدہ میوے جیسے سیب، ناشپاتی، انناس، انار وغیرہ ایران سے آئے۔ مہدی ہندستان کی چیز ہے اور اسے بیگمات نے خوب اپنایا۔

مختصر یہ کہ عہدِ اسلامی میں ہندستان نے ہر صنف میں ترقی کی، اور ہندو مسلمانوں کے میل جول سے مجموعی طور پر ہندستان اتنا آگے بڑھا کہ کسی دور میں نہ بڑھا تھا۔ اسی لئے عہدِ اسلامی کو ہندستان کا سنہرا زمانہ کہا جاتا ہے۔

ہندو مسلم کلچر

یہی وہ تمدن ہے جسے ہندو مسلمانوں کے میل جول نے ایک ہزار سال میں پیدا کیا۔ ہم اس تمدن کو نہ مسلم تمدن کہہ سکتے ہیں اور نہ ہندو تمدن۔ بلکہ یہ ہندو مسلم تہذیب (INDO-MUSLIM CULTURE) ہے۔ اس کے پیدا کرنے میں ہندوؤں نے بھی اتنا ہی حصہ لیا جتنا مسلمانوں نے۔ مسلمان صدیوں سے اس امتزاجی اور ترکیبی تمدن کی تعمیر میں حصہ لے رہے ہیں، اور انھوں نے ہندستان کی زبان، ادب، تاریخ، فلسفہ، مصوری، طرزِ تعمیر، موسیقی غرضیکہ ہر چیز پر

کا کچھ کم حصہ نہیں رہا حقیقت یہ ہے کہ ہندستانی موسیقی کو انتہائی عروج سلاطین اسلام ہی کے درباروں میں نصیب ہوا۔ ہندستان کا دلکش ترین ساز یعنی ستار حضرت امیر خسرو کی ایجاد ہے۔ سرود اور دلربا بھی مسلمانوں ہی کی ایجاد ہے۔ ہندستانی موسیقی کی قدیم کتاب "سنگیت پریجات" کو عملی جامہ اکبر کے زمانے میں تان سین، امیر خسرو، اور سدا رنگ نے پہنایا۔ موجودہ زمانے میں جو راگ موسیقی کا انتہائی کمال سمجھے جاتے ہیں یعنی ترانہ اور خیال یہ مسلمانوں ہی کی ایجاد ہیں۔ ٹھمری بھی مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ اسی طرح اور بھی بہتیری راگ راگنیاں مسلمانوں نے ایجاد کیں۔ مسلمان ہندستانی موسیقی میں کس قدر رچ بس گئے ہیں اس کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ گذشتہ بیس[۲۰] پچیس[۲۵] سال کے اندر جتنی ہر دلعزیز دُھنیں نکلیں وہ مسلمان گویوں کی ایجاد تھیں، اور اُن میں شروع شروع نعتیں کہی گئی تھیں۔

اِس مقام پر تو والہانہ طور پر ہندو مسلمان ایک دوسرے سے متحد نظر آتے ہیں۔ زیادہ تر کلاسکل گانے ہندو دیوتاؤں کی تعریف میں ہیں۔ جنھیں مسلمان گویے بھی اُسی ذوق و عقیدت کے ساتھ گاتے ہیں جیسے ہندو کرشن کی شان میں ایک مشہور گانا، جس کے بول ہیں ع۔ نیر بھرن کیسے جاؤں سکھی ری ــ ' اندور کے گوئیے بندے علی کا کہا ہوا ہے۔ سرسوتی کی تعریف میں ایک بھیرویں جس کے بول ہیں ع۔ سرسوتی شاردا دیا دانی دیانی " بڑودہ کے مشہور گوئیے مولا بخش نے کہی ہے۔

موسیقی انسان کی نفسی کیفیات کا ایک عکس ہے، اور قلبی سوز و گداز کا ایک نمونہ۔ انسان اسی زبان میں اپنے لطیف سے لطیف اور نازک سے نازک جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ اگر مسلمان اس مقام پر ذرا بھی عصبیت کو راہ دیتے اور اُنکے دل میں کافروں کے اصنام سے رتّی بھر بھی نفرت ہوتی تو وہ اس میدان میں اسطرح آگے نہ جاسکتے تھے۔ نفرت، دل سے کوئی حسین چیز پیدا نہیں کرسکتی۔ ہندستانی موسیقی کا قالب اور ماحول از سرتاپا ہندو ماحول ہے جسکی بنیاد ہندو علم الاصنام پر ہے لیکن مسلمانوں نے، مسلمان رہتے ہوئے اسکو مشترکہ ورثہ بنایا اور اس میں کمال حاصل کیا۔ شاہ جہاں، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ہندو دشمن تھا، اُس نے ایک بار اپنے درباری گوئیے کویرآج رام داس کو، ایک اچھے گانے پر جو کرشن کی تعریف میں تھا، سونے سے تلوایا۔ اسی رام داس کو عبدالرحیم خانخاناں نے ایک بار ایک لاکھ روپیہ نذر کیا تھا۔

اِسی طرح ہندستانی مصوری بھی عہد اسلامی میں خوب خوب چمکی، اور اس پر ہندو اثر کافی پڑا۔ مسلمان مصوروں نے مانگول اور چینی شباہت (FEATURES) کی جگہ آرین اور ہندستانی شباہت کو جگہ دی۔

جہانبانی وسیاست

مسلمانوں کے فنِ جہانبانی وحکمرانی سے بھی ہندستان نے بہت کچھ سیکھا۔ اشوک کے بعد ہندستان میں اتنے بڑے پیمانے پر کوئی سلطنت قائم نہ ہوئی تھی جتنی بڑی سلطنت مسلمانوں نے قائم کی۔ مغلوں نے حکومت کی ایک ایسی عظیم الشان مشینری کھڑی کی، اور اتنے اعلیٰ پیمانہ پر ملکی نظم ونسق چلایا کہ اُنکی حکومت نے اس دور کیلئے ایک سیاسی فن کی حیثیت اختیار کرلی۔ مغلوں کے بنائے ہوئے لگان اور عدل کے قوانین آجتک ہندستان میں چل رہے ہیں، اور ہندستان کو انہوں نے جس طرح مختلف صوبوں پر تقسیم کیا تھا۔ ان صوبوں کے حدود آجتک کم وبیش وہی ہیں۔

مسلمانوں کے آنے سے ہندستان کے فوجی علم میں بھی کافی اضافہ ہوا۔ اس وقت تک ہندستان میں پُرانے طریقوں پر لڑائی ہوتی تھی۔ ہاتھیوں کی صفوں پر سب سے زیادہ بھروسہ کیا جاتا تھا۔ لیکن مسلمان حملہ آوروں نے ہندو ملیٹری سائنس کا تختہ ہی اُلٹ دیا، اور بتلادیا کہ جنگ میں فیصلہ کُن بازو سواروں کا ہے۔ راجپوتوں نے بہت جلد مسلمانوں کی کامیابی کا راز سمجھ لیا اور اپنی فوجوں کو نئے سرے سے ترتیب دی۔

فنِ تعمیر موسیقی اور مصوّری

ہندو اور مسلمانوں کے ثقافتی اتحاد کا ایک اور ناقابلِ محو ثبوت عہد اسلامی کا فنِ تعمیر ہے، جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دونوں کلچر کس طرح شیر وشکر کیطرح آپس میں ملتے جارہے تھے۔ مثال کے طور پر جونپور کی عمارتوں کو لیجئے جن کی تعمیر ابراہیم شاہ شرقی کے وقت (۱۴۰۱ء) میں ہوئی۔ ان عمارتوں کے دروازے اور دالان ایرانی طرز کے ہیں لیکن اندر کی گیلریاں اور کھمبے ہندو طرز کے ہیں۔ بنگال اور گجرات میں بھی، جہاں عرصہ دراز تک آزاد مسلم سلطنتیں رہیں، ہندو مسلم طرز کی عمارتیں موجود ہیں۔ گجرات میں علاؤالدین کی بنائی ہوئی عمارت، ہندو مسلم اور جین طرز تعمیر کا ایک مخلوط نمونہ ہے۔ کیمبے (کاٹھیاواڑ) کی مسجد اور سردار خاں کی بنائی ہوئی مسجد کے گنبد ہندو اسٹائل کے ہیں۔ لیکن دکن کی عمارتوں میں ہندو اسٹائل اور زیادہ نمایاں معلوم ہوتا ہے۔

آگرہ کا مشہورِ زمانہ تاج، ہاول (HOWELL) کے مطابق ہندو خاکہ پر بنایا گیا ہے، جسے پنج رتن، کہتے تھے۔ اسی طرح سکندرہ کے صدر (بچلے) گنبد کے علاوہ تمام گنبد راجپوت ڈھنگ کے ہیں۔ قطب مینار پر بھی ہندو اور راجپوت اثر بہت نمایاں ہے۔ غرضیکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ارتباط نے وہ وہ انمول نمونے تیار کئے۔ جن کا دنیا میں جواب نہیں۔

یہ سمجھنا کہ ہندستانی موسیقی، صرف ہندوؤں کے اعلیٰ ذوق کا نتیجہ ہے، غلط ہے۔ اس صنف میں بھی مسلمانوں

اصلاحی تحریکوں پر اسلامی اصولوں اور ہندو فلسفہ کا مساوی اثر تھا۔

لیکن یہ اثر یکطرفہ نہ تھا۔ مسلمانوں پر بھی ہندو ئیت کا کافی اثر پڑا۔ مسلمان، ہندو جوگیوں اور فقیروں سے اعتقاد رکھنے لگے۔ خواجہ خضر اور شیخ سدو کے چڑھاوے چڑھائے جانے لگے۔ مسلمان بھوت، چڑیل وغیرہ کو ماننے لگے۔ قبر پرستی اور تعزیہ داری حد سے زیادہ بڑھ گئی۔ ہندو چڑھاوے کے طرز پر نیاز و فاتحہ ہونے لگے۔ مسلمانوں میں فقیروں اور جوگیوں کا طبقہ پیدا ہو گیا۔ مسلمان فقرا بودھوں کی طرح گیرو رنگ کا کپڑا پہننے لگے۔ نسلی امتیاز اور تفوق بھی شروع ہو گیا۔ پیشوں کی بنا پر جولاہا، قصائی، کنجڑا، درزی، وغیرہ ذاتیں پیدا ہو گئیں۔ ایک ایرانی مسلمان جو ہندستان میں آ کر بس گیا تھا اس نے تو حد ہی کر دی۔ اس کی ایک تصنیف ہے "دس اوتار" جس میں وشنو کے دس اوتار مانے گئے ہیں۔ اور اس میں حضرت علیؓ کو بھی وشنو کا ایک اوتار مانا گیا ہے۔ پردے کا رواج بھی مسلمانوں نے راجپوتوں سے لیا۔ یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام نے اس ملک کو پردے سے روشناس کیا۔

غرضیکہ ہندو اور مسلمان ایکدوسرے سے کافی متاثر ہوئے۔ ہندوؤں کی عدم رواداری کم ہوئی، ظالمانہ مذہبی رسمیں جیسے ستی وغیرہ ختم ہونے لگیں اور ہندو سماج کے ہر شعبے میں اصلاح کی لہر دوڑ گئی، جس کا اصلی سبب یہ تھا کہ ہندوؤں کو مسلمانوں کے ترقی یافتہ سماجی قوانین سے رابطہ پیدا ہوا اور ان دونوں کے پرکھنے کا موقع ملا۔ حال ہی میں برہمو سماج اور آریہ سماج تحریکیں بھی اسی رابطہ کا نتیجہ تھیں۔ ان تحریکوں اور خاصکر آریہ سماج تحریک کی بنیاد قطعاً اسلامی اصولوں پر ہے۔ آریہ سماج دھرم نے مورتی پوجا کو ناجائز ٹھہرایا۔ ہندو بیواؤں کو شادی کا حق دیا اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کو ہندو دھرم میں شدھ کر کے داخل کرنے کی رسم بھی جاری کی جو برہمنی مذہب کے قطعاً خلاف ہے۔ کچھ عرصے سے ہندوؤں میں یہ تحریک زور پکڑ رہی ہے کہ عورتوں اور مردوں کو طلاق کا حق دیا جائے، ہندو لڑکی کو والدین کے ترکے سے محروم نہ رکھا جائے، اور عورتوں اور مردوں کو مساوی آزادی اور حقوق ملیں۔ جو قطعاً اسلام کے ترقی یافتہ قانون کے زیر اثر ہے۔

اس طرح رفتہ رفتہ ہندو تہذیب اسلامی معاشرت کے قوانین کو ایک ایک کر کے اپنا رہی ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں نے بھی زندگی کے ہر شعبے میں اور خاصکر شادی بیاہ کے ہندو رسوم کو اپنایا۔ ہندو معاشرت نے مسلمان مردوں سے زیادہ مسلمان عورتوں پر اثر ڈالا ہے۔ ہندستان کی مسلمان اور ہندو عورتوں میں بہت کم فرق معلوم ہوتا ہے۔

ایسا اثر ڈالا ہے کہ انکی شکل و صورت ہی بدل دی ۔ یہ صحیح ہے کہ ہم اس تمدن کے مندرجہ بالا لوازمات کا جائزہ لیں تو آسانی سے یہ تمیز کر سکتے ہیں کہ کون سی چیز مسلم ہے اور کون سی ہندو ہم دونوں اس کے دعویدار ہو سکتے ہیں، لیکن ہم ان دونوں کو جدا نہیں کر سکتے ۔ آپ ان دونوں میں سے کسی اثر کو خارج کر دیں اور یہ چیزیں بالکل لغو اور مہمل ہو کر رہ جائیں گی ۔ یہ دونوں اثرات ایک دوسرے کی خوبیوں کو نمایاں کرتے اور مزین کرتے ہیں جس طرح انسان کی دو آنکھیں ۔

اس متحدہ تہذیب کے بہاؤ کے روکنے کی کوشش کرنا سراسر حماقت اور اپنے بزرگوں کی صدیوں کی کوششوں پر پانی پھیرنا ہے ۔ تاریخ نے جو فیصلہ کر دیا ہے وہ اٹل ہے ۔ قدرت نے صدیوں کی کوشش میں یہ سانچہ تیار کیا ہے اور ہمیں اس میں ڈھالا ہے ۔ جس طرح اس کے بنانے میں ہمارے ارادے کو کوئی دخل نہ تھا اسی طرح اس کے مٹانے میں ہماری رائے اور خواہش کو کوئی دخل نہیں ۔ قسمت کب کی یہ فیصلہ صادر کر چکی اور ہمیں "ہندستانی قوم" بنا چکی ۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر سر تسلیم خم کر دینا چاہیئے ۔

ہندستان کے تمدنی اختلافات

مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ "ہندو تہذیب اور مسلم تہذیب دو جدا جدا چیزیں ہیں" یقینی کسی طرح قابل تسلیم نہیں ۔ تہذیب کی مظہر یہی چیزیں ہیں جو اوپر بیان کی گئیں ۔ یعنی زبان، ادب، فن تعمیر، سنگ تراشی، مصوری، موسیقی لباس وغیرہ ۔ کیا ہندو اور مسلمانوں کے کلچر میں ان صفتوں میں کوئی بیّن فرق موجود ہے ۔ کیا یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہندو زبان ہے اور یہ مسلم زبان ہے، یہ ہندو ادب ہے اور یہ مسلم ادب ہے، یہ ہندو موسیقی اور یہ مسلم موسیقی ہے، یا یہ ہندو لباس اور یہ مسلم لباس ہے؟ ہندستانی موسیقی کو عہد مغلیہ میں سب سے زیادہ عروج ہوا لیکن راگوں کے نام دیکھ لیجیے، سوائے خیال اور ترانہ کے سب سنسکرت ہیں ۔ سارے مشرقی ہندستان کے لوگ ہندستانی بولتے ہیں، ہندو مسلمان زبان اردو میں شاعری کرتے ہیں ۔ لباس بھی مسلمانوں کا کوئی خاص نہیں، شیروانی پاجامہ ہندو بھی پہنتے ہیں اور دیہات کے ۹۰ فیصدی مسلمان تو دھوتیاں باندھتے ہیں ۔ مسلمان عورتیں ساریاں باندھتی ہیں اور ہندو اور سکھ عورتیں پائجامہ اور شلوار پہنتی ہیں ۔ لہٰذا یہ کہنا کہ مسلمانوں کا تمدن ہندوؤں سے علیحدہ ہے ۔ حقیقت کے خلاف ہے اور تاریخ کو جھٹلانا ہے ۔

جیسا کہ میں اوپر کہہ آیا ہوں مسلمانوں کے تمدنی محرکات یقینی ہندوؤں سے مختلف رہے ہیں، ایک مسلمان اور ایک ہندو کے تصورات زندگی میں ہمیشہ فرق رہا ہے ۔ اور جیسا کہ قانون قدرت ہے چند مخصوص

اصولوں کے ماتحت ایک مخصوص تمدّن ڈھل سکتا ہے اس لئے ہمیں اس سے انکار نہیں کہ ان اصولوں کے ماتحت ایک مخصوص تمدّن پیدا ہوا لیکن اوّل تو اس تمدّن کو ہندوؤں نے بھی قبول کر لیا اور دوسرے یہ کہ زندگی کے وہ اصول جو مسلمان اپنے ساتھ لائے تھے عملی طور پر انھیں رفتہ رفتہ کھو بیٹھے۔ ہندو اور مسلمان دونوں نے اپنے تصوّرات اور اصولوں میں سمجھوتہ کیا اور وہ ایک دوسرے کے تصوّرات زندگی پر بھی بیحد اثر انداز ہوئے۔ اسی لئے آج ہم ایک ایسا ہندو مسلم تمدّن دیکھ رہے ہیں جس میں بہت زیادہ یکسانیت پائی جاتی ہے۔

لیکن یہ کہنا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے کلچر میں کوئی فرق ہی نہیں۔ سراسر غلط ہے۔ تفصیلات میں آنے کے بعد ہمیں ہندو اور مسلمانوں کی تہذیب میں فرق محسوس ہوتا ہے۔ جیسے مسلمانوں کے چہرے پر (انگریزی تعلیم یافتوں کے ماسوا) ڈاڑھیاں ہوتی ہیں۔ وہ ایک خاص قسم کا لوٹا استعمال کرتے ہیں۔ ان کے کھانے کا طریقہ جُدا ہے۔ کھانے میں بھی ہندوؤں کے برخلاف گوشت کا جزو زیادہ ہوتا ہے۔ ان کے تہوار علیحدہ ہیں اور شادی بیاہ کا طریقہ مختلف ہے، گرچہ اس میں ہندو رسمیں کثرت سے شامل ہیں۔ مسلمان کی زندگی کا معیار بلند ہے، وہ اپنی زندگی پر ہندو کی بہ نسبت زیادہ خرچ کرتا ہے۔ پردہ مسلمانوں میں ہندوؤں سے زیادہ ہے۔ مسلمان خاندان کے مکان بھی خاص طرز کے بنائے جاتے ہیں۔ شاعری وغیرہ میں بھی مسلمانوں کے محرکات (INSPIRATIONS) مختلف ہوتے ہیں۔ معاشرتی و مجلسی آداب بھی بیّن طور پر جُدا ہیں۔ بول چال میں عموماً مسلمان فارسی و عربی کے الفاظ زیادہ استعمال کرتے ہیں اور ہندو سنسکرت وغیرہ کے۔ مگر ان اختلاف کی بنا پر یہ دعویٰ صحیح نہیں ہو سکتا کہ مسلمان اور ہندوؤں کا کلچر بالکل مختلف ہے اور اس لئے یہ دو جُدا جُدا قومیں ہیں۔ مسلمانوں کے جو تمدّنی خصوصیات ہیں انکی حفاظت کرنی چاہیئے اور وہ اس کے باوجود ہندستانی قوم کے جزو رہ سکتے ہیں اگر وہ ان معمولی اختلافات کی بنا پر دو قومیں بنانا چاہتے ہیں تو پھر مسلمانوں کی بھی ایک قوم نہیں بن سکتی۔ ایک بنگالی مسلمان اور ایک سرحدی یا پنجابی مسلمان میں یا ایک سندھی اور ایک مدراسی مسلمان کے کلچر میں اتنا ہی فرق ہے جتنا تبّتی اور ایک ہندستانی میں۔

ہندستانی مسلمانوں میں کبھی تمدّنی ہم آہنگی نہیں رہی۔ جب مسلمان ہندستان آئے تب بھی وہ عرب، ترک، تاتاری وغیرہ مختلف قوموں میں بٹے ہوئے تھے۔

اصل یہ ہے کہ ہندستان کا کلچر ہندو یا مسلم کلچر نہیں بلکہ صوبائی کلچر ہے، ہر صوبے کا کلچر جُدا ہے اور دوسرے صوبے سے نہیں ملتا۔ مدراس، بمبئی، بنگال، گجرات، سندھ، سرحد، پنجاب، کشمیر ان تمام صوبوں

کی جدا جدا زبانیں اور تہذیب ہیں اور ہر صوبے کے باشندے خواہ وہ کسی مذہب وملت کے ہوں، ایک ہی کلچر میں رنگے ہوئے ہیں۔ پنجاب کے ہندو مسلمان اور سکھوں کا ایک کلچر ہے۔ ان میں تمیز کرنا کہ کون مسلمان ہے اور کون ہندو، مشکل ہے۔ بنگال کے ہندو مسلمان بھی ایک ہی تہذیب رکھتے ہیں۔ لہذا اگر اس طرح دیکھا جائے تو ہندستان، بنگالی قوم، پنجابی قوم، مدراسی قوم، سندھی قوم، اور کشمیری قوموں میں بنٹا ہوا ہے، اور اس لحاظ سے ایک ہندستانی قوم کہنا مشکل ہوگا۔ پھر علیحدہ علیحدہ ذاتوں کو لیجئے۔ تو ان کے کلچر میں بھی نسبتاً فرق ملے گا۔ ایک راجپوت یا برہمن کا، اور ایک چمار کا کلچر یقینی مختلف ہے۔ اسی طرح شیعہ، سُنی۔ مومن اور سید کے کلچر میں بھی فرق پائے جائیں گے۔

لیکن ان تفصیلی اختلافات کو نظر انداز کر کے کلچر کے وسیع مفہوم کو سامنے رکھکر دیکھا جائیگا تو ہندستان کے باشندوں میں کلچر کی موٹی موٹی خصوصیات مشترک ملیں گی۔ جو ایک ملک میں سیکڑوں برس کے رہنے سہنے کے بعد پیدا ہوئیں اور یہی ہندستانی یا ہندو مسلم (INDO-MUSLIM CULTURE) کلچر ہے۔

قومیت کی بحث توقع سے زیادہ طول پکڑ گئی۔ ہندستانی قومیت کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے بعد ہمارے سامنے یہ چیز بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ متحدہ قومیت کیلئے جن شرائط کی ضرورت ہے وہ تمام کے تمام ہندستان کے ہندو مسلمان پورا کرتے ہیں اور قومیت کی جملہ تعریفیں ہم پر پورے طور پر صادق آتی ہیں۔ مزید برآں نسلی اتحاد، جو قومیت کا جزو لاینفک تو نہیں، مگر اسے یقینی قوی بناتا ہے، ہندستان کے ہندو اور مسلمانوں کے بیچ موجود ہے۔ وطنی، لسانی، تمدنی، تاریخی، معاشی، سیاسی اور یہاں تک کہ نسبی، تمام قسم کے اشتراک جو دنیا کی کسی قوم میں پائے جاتے ہیں یہاں بھی موجود ہیں۔ اگر بدیانتی کو راہ نہ دی جائے تو اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ ہندو مسلمان ایک قوم (NATION) ہیں۔ اگر ان تمام خصوصیتوں کے باوجود ہندو مسلمانوں کو ایک قوم نہیں کہا جاسکتا تو اس کا یہ مطلب ہے کہ دنیا میں کوئی قوم ہی نہیں۔

ہاں ہمارے درمیان ایک چیز یقینی ایسی ہے، جو مشترک نہیں ——یعنی مذہب۔ اور یقینی یہ بہت بڑا اختلاف ہے۔ لیکن متحدہ قومیت بنانے میں یہ کسی طرح حائل نہیں۔ دنیا کی اکثر قومیں مختلف المذاہب ہونے کے باوجود ایک قوم ہیں۔ جیسے چین کے بودھ، عیسائی، مسلمان مل کر چینی قوم کہلاتے ہیں، مصر کے عیسائی، یہودی، قبطی اور مسلمان مل کر ایک قوم ہیں، ایران کے مسلمان اور زرتشتی ایک ایرانی قوم ہیں، روس کے عیسائی،

مسلمان، یہودی وغیرہ مل کر ایک 'روسی قوم' ہیں، اور ٹرکی کے مسلمان، عیسائی، یہودی، مجوسی مل کر ٹرکی قوم کے نام سے پکارے جاتے ہیں، تو ہم ہندستان کے ہندو، مسلمان، عیسائی اور پارسی مل کر ایک ہندستانی قوم کیوں نہیں۔ وطنی قومیت بنانے میں ہمیں اسلام بھی نہیں روکتا۔ قومیت کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے اس پر اگلے باب میں تفصیل سے بحث کی جائے گی۔

کیا ہندستان ایک ملک نہیں

مصنفِ اسکیم اور مسٹر جناح کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ ہندستان ایک ملک نہیں اور شمالی و مغربی صوبوں کو کبھی ہندستان کا جزو نہیں سمجھا گیا۔

اس دعویٰ کی لغویت اس قدر بیّن ہے کہ اس پر کسی بحث کی گنجائش نہیں۔ ایک نویں جماعت کا طالب العلم بھی جانتا ہے کہ سکندر اعظم سے لیکر آج تک اِس ملک کا ایک ہی نام رہا ہے۔ ہیوئن سانگ، فاہیان، ابن بطوطہ وغیرہ نے بھی اسے ایک ہی ملک مانا۔ چندر گپت سے لیکر اس وقت تک ہمیشہ شمالی و مغربی صوبوں کو ہندستان کا ایک جزو سمجھا گیا، بلکہ سکندر نے سارے ہندستان کا نام اِسی صوبہ پنجاب کے دریا سندھ INDUS کے نام پر INDIA رکھا۔ انڈیا سے ہند ہوا اور پھر ہند کو مسلمانوں نے 'ہندستان' بنا دیا۔

ہاں یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے آنے سے قبل ہندستان کسی واحد سیاسی رشتے میں منسلک نہ تھا، لیکن زمانۂ قدیم میں تو ساری دنیا میں اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں۔ موجودہ زمانہ میں جس طرح بڑے پیمانہ پر شہنشاہتیں ہیں، اُس زمانے میں سکندر، روما، اسیائر اور گپتا شہنشاہیوں کے ماسوا اتنی بڑی بڑی شہنشاہیتیں نہ تھیں۔ خود انگلستان، سات حکومتوں (HEP TARCHY) میں منقسم تھا۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ انگلستان سات ملکوں میں بٹا ہوا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ پنجاب پر زیادہ تر مسلمانوں کا راج رہا لیکن پنجاب پر ایک سرحدی صوبہ ہونے کے سبب، جیسا کہ سرحدی صوبوں کے ساتھ اکثر ہوا کرتا ہے، ہر حملہ آور نے پہلے قبضہ کر لیا۔ لیکن چند استثنا کے ماسوا پنجاب ہمیشہ دہلی کی مرکزی حکومت کے ماتحت رہا۔

ہندستان کو جغرافیائی حیثیت سے ایک ملک تسلیم نہ کرنا اوّل درجے کی حماقت ہے یا بد دیانتی۔ قدرتی طور پر تو ہندستان ایک ایسا بنا بنایا ملک ہے، جیسا دنیا کا کوئی دوسرا ملک نہیں۔

"قومیّت" کے متعلق اسلام کا نظریہ

کچھ عرصے سے ایک سیاسی گروہ کی طرف سے مسلمانوں میں یہ پروپیگنڈا بڑے شد و مد سے کیا جا رہا ہے کہ اسلام وطنیت اور قومیت کے بالکل منافی ہے۔ وہ نسل، زبان اور وطنیت وغیرہ کی بناء پر قومیت کو تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کے نزدیک قوم وہی ہے جس کے درمیان ایک دینی رشتہ ہو، جیسے مسلمان، عیسائی وغیرہ اور مختلف المذاہب فرقے، خواہ اُن کے درمیان وطنیت وغیرہ کا کیسا ہی مضبوط رشتہ کیوں نہ موجود ہو، اسلام انھیں ایک قوم تسلیم نہیں کرتا۔ پنجابی صاحب نے بھی اپنی کتاب میں اسی دعویٰ کا اعادہ کیا ہے اور مسلمانوں کو یہ بتلایا ہے کہ مسلمان، دائرۂ اسلام میں رہتے ہوئے کسی وطنی قومیت کے جزو نہیں ہو سکتے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ایک قوم کیلئے ہم مذہب ہونا لازمی ہے، اس لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی قومی رشتہ نہیں ہو سکتا۔ آپ لکھتے ہیں :-

"اسلام کا نظریۂ قومیت مغرب کے موجودہ تخیّلِ قومیت سے قطعاً جدا ہے۔ اس کی بنیاد مخصوص عقائد ہیں جن کا تعلق دنیا و آخرت کی زندگی، تاریخی رسم و روایات اور ایسے عالمگیر برادرانہ جذبے سے ہے جس کے نزدیک تمام مسلمان خواہ وہ کہیں رہتے سہتے ہوں ایک واحد سوسائٹی کے جزو ہیں۔ وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں اور وہ سب خدائے قدوس کے بندے ہیں۔"

(کانفڈریسی آف انڈیا ۱۷)

پھر آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں :-

"ساری دنیا کے مسلمان ایک ملت (NATION) ہیں جس طرح یہودی خواہ وہ جرمن، انگریز، یا روسی کچھ بھی ہوں، ایک ملت کہے جاتے ہیں۔ چونکہ اسلامی قومیت وطنی اور نسلی قومیت کے منافی ہے، اس لئے مسلمان، چاہے وہ دنیا کے کسی حصہ یا نسل سے تعلق رکھتے ہوں وہ نسلی اُلفت و محبت اور حُبِّ وطنی کے جذبات سے قطعاً بالاتر ہیں۔"

(ایضاً - صفحہ ۲۷)

غرضیکہ پنجابی صاحب کے نزدیک اسلام وطنی یا نسلی قومیت کے منافی ہے اور وہ صرف ایک ہی قسم کی قومیت تسلیم کرتا ہے، جس کی بنیاد مذہب ہے۔ آپ کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ ایک سچا مسلمان نسلی اُنس و محبت اور

حبِ وطنی کے جذبات سے بالاتر ہے۔ یہاں ہمیں اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہے کہ یہ کہاں تک صحیح ہے۔

وطن کی محبت ماں کی گود سے شروع ہوتی ہے۔ یہ ایک فطری جذبہ ہے۔ اس میں کافر و مومن، گبر و مسلمان، اور مہذب یا غیر مہذب کا کوئی فرق نہیں۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ جس سرزمین پر وہ پیدا ہوتا ہے، جس سرزمین کا وہ اناج کھاتا ہے، جس کا پانی پیتا ہے اور جس جگہ پر وہ عیش و آرام اور حفظ و امان کے ساتھ رہتا ہے، اُس سے، اُسے ایک فطری محبت ہو جاتی ہے۔

اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک دینِ فطرت ہے۔ اُس نے انسان کے کسی جذبہ کو جسے انسان کی فطرت سے لگاؤ ہے، کچلنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان جذبات کو سراہا اور انھیں تقویت پہنچائی۔ دنیا میں ایسے ایسے مذاہب بھی آئے جنھوں نے انسان کو غیر فطری باتوں کی تعلیم دیکر انسان سے فرشتہ بنا دینا چاہا۔ ان مذاہب نے تجرد کی زندگی بسر کرنے، دشمن کے ایک طمانچے پر دوسرا گال پیش کر دینے، تعدد ازدواج کو روکنے، مال و متاع چھوڑ کر پہاڑوں میں جاکر عبادت کرنے، کسی جاندار کو ایذا نہ پہنچانے اور فاقہ کرتے کرتے مر جانے وغیرہ وغیرہ کی تعلیم دی لیکن مذہبِ اسلام نے کبھی ایسے لغو احکامات جاری نہ کئے جو فطرتِ انسانی کے خلاف ہوں۔ اُس نے انسان کو اُس کے فطری حق سے محروم نہ کیا۔ بلکہ اس کے برخلاف حکم دیا کہ عیش و آرام سے رہو، مال و متاع حاصل کرو، بلکہ ممکن ہو تو دنیا میں جہانبانی کرو، اپنے دشمن سے انتقام لو، جو جانور تم پر حلال کئے گئے ہیں ان کا گوشت کھاؤ۔ ایک سے زیادہ شادیاں کرو، وغیرہ وغیرہ۔ غرضیکہ اسلام نے اُس چیز کو کبھی روکنے کی کوشش نہ کی جس کا لگاؤ فطرتِ انسانی سے ہے۔ یہاں تک کہ لونڈی اور غلام رکھنے تک کو اسلام نے مصلحت کی بنا پر حکماً نہیں روکا بلکہ مومنین کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ ایک ایسے دینِ فطرت پر یہ الزام لگانا کہ وہ انسان کے قدرتی جذبۂ وطنیت، نسلیت، یا لسانیت کے خلاف ہے، اسلام پر سراسر اتہام لگانا ہے۔ اسلام نے نسل، وطن اور قومی عصبیتوں کو ختم نہیں کیا بلکہ ان پر اپنی مہر تصدیق ثبت کی اور انھیں تقویت دی۔ مگر ہاں اس کے نقصانات کا سدِ باب کر دیا۔ یعنی نسلی تکبر اور فخر و مباہات کی مذمت کی۔ اس طرح اسلام نے اِن عصبیتوں کو رکھتے ہوئے ان کے نیش کو توڑ دیا۔

قرآن پاک اور احادیث سے ثابت ہے کہ اسلام نے خون کے رشتے کو تسلیم کیا ہے، ماں باپ کی فرمانبرداری و اطاعت کا حکم دیا ہے، خون کے رشتہ کی بنا پر قانونِ وراثت بنایا ہے، خیرات کرتے وقت یہ حکم دیا ہے کہ پہلے "ذوی القربیٰ" کی امداد کرو اس کے بعد ان لوگوں کی جو تم سے دور یعنی "غیر ذوی القربیٰ" ہیں۔ اہل و عیال، اپنے گھر بار، اور وطن کو دشمنوں سے بچانے کا حکم دیا ہے۔ پڑوسی کے حقوق تسلیم کئے ہیں۔ ظالم کے مقابلے میں لڑنے کا حکم دیا ہے اور اس میں کٹ مرنے والوں کو شہید کا درجہ دیا ہے۔ غیر مسلموں کے ساتھ ہمدردی، اخلاق و شرافت

رواداری، حسن سلوک اور محبت سے پیش آنے کی تعلیم دی ہے۔ غرضیکہ اسلام نے دین فطرت ہونے کے سبب ان تمام اُمور کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اُن کیلئے احکام صادر کئے۔ کیونکہ یہ تمام چیزیں انسانی فطرت اور اس کے شریفانہ جذبے سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ چیزیں اس قدر کھُلی ہوئی اور بیّن ہیں کہ ہر مسلمان انھیں جانتا اور روزانہ زندگی میں برتتا ہے۔

قومیّت قرآن وحدیث کی روشنی میں

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مدیر رسالہ ترجمان القرآن، جو تحریک پاکستان کے فلسفی ہیں، اپنی تصنیف "مسئلہ قومیت" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"آپ پورے قرآن کو دیکھ جائیے اس میں ایک لفظ بھی آپ کو نسلیت یا وطنیت کی تائید میں نہ ملے گا۔ (صفحہ ۱۲)

مولانا کے دعویٰ کے خلاف سب سے پہلے یہ آیت پیش کی جاسکتی ہے۔

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ۔ (الحجرات)

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو گروہ اور قبائل میں تقسیم کردیا تاکہ تم آپس میں پہچانے جاؤ لیکن تم میں معزز وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

ملاحظہ ہو خداوند قدوس خود فرماتا ہے کہ میں نے تم کو علیحدہ علیحدہ گروہ اور نسلوں میں تقسیم کیا۔ قبیلہ ایک نسل کے ایک گروہ کو کہتے ہیں۔ پھر اس تقسیم کا مطلب بھی بتا دیا کہ "تاکہ تم آپس میں ایک دوسرے سے پہچانے جاؤ" اس کا صاف اور صریحی مطلب یہ ہے کہ اسلام نسل اور وطنیت کی بنا پر گروہ اور قبیلے تسلیم کرتا ہے۔ لیکن پھر آگے چل کر نسلیت کے بعض مضرات جیسے نسلی تفوق وغیرہ کے پیش نظر متنبّہ کر دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اپنے اپنے قبیلہ اور نسلی تفاخر میں بھولے رہو اور عملِ صالح کی طرف دھیان نہ دو۔ تم خواہ کسی اونچے سے اونچے قبیلہ سے تعلق رکھتے ہو، لیکن اللہ کے نزدیک تم میں اونچا اور افضل وہی ہے جس کے عمل صالح ہوں۔

کلام پاک میں قوم کا لفظ متعدد مقامات پر آیا ہے اور کہیں کہیں پر ان کے معنوں میں بھی اختلاف

ہے۔ عربی زبان میں قوم کے معنی "ایک مطلق گروہ" کے ہیں۔ لیکن کلام پاک میں یہ لفظ حسب ذیل معنوں میں استعمال کیا گیا ہے :۔

(۱) ایک مطلق گروہ یا جماعت کے معنی میں (۲) خاص مومنوں کیلئے (۳) صرف کفار کیلئے (۴) کافر و مومن دونوں کیلئے۔

۱۔ "قوم" ایک مطلق گروہ کے معنی میں

ذَالِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ — یہ اس لئے کہ یہ لوگ عقل نہیں رکھتے۔

(مائدہ)

بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ — اس لئے کہ یہ لوگ نہیں سمجھتے۔

اِنَّهُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ — تم انجان لوگ ہو۔

(توبہ)

۲۔ "قوم" خاص مومنوں کیلئے

فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكَافِرِيْنَ۔ (انعام) — تو ہم نے اس کیلئے وہ قوم مقرر کی ہے جو اس کی منکر نہیں۔ (یعنی مسلمان قوم)

لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (البقرہ) (مائدہ) (جاثیہ) — یقین کرنے والوں کی قوم (یعنی مومنین)

۳۔ "قوم" صرف کافروں کیلئے

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِيْنَ (البقرہ) — اور اللہ کافر قوم کو راہ نہیں دکھاتا۔

۴۔ "قوم" ایک ایسی جماعت کیلئے جس میں کافر و مومن دونوں تھے

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، فرماتے ہیں :۔

"اس (خداوند تعالیٰ) نے انسان کے سامنے ایک فطری صداقت پیش کی جس کا نام اسلام ہے۔ اُس نے خدا کی بندگی و اطاعت، نفس کی طہارت و پاکیزگی، عمل کی نیکی اور پرہیزگاری کی طرف ساری نوع بشر کو دعوت دی۔ پھر کہدیا کہ جو اس دعوت کو قبول کرے وہ ایک قوم سے ہے اور جو اس کو رد کرے وہ دوسری قوم سے۔"

(مسئلہ قومیت صفحہ ۱۸)

مولانا کا یہ دعویٰ کہ خداوند تعالیٰ نے مومنوں کی ایک قوم بنائی اور کافروں کی دوسری قوم، یہ

درست نہیں۔ خداوند تعالیٰ نے خود کلام پاک میں کئی جگہ کافر اور مومن' دونوں کو ایک 'قوم' کہا۔ جس کا ثبوت ذیل کی آیات ہیں:۔

وَاِذْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ (نوح) — اور جب ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف مبعوث کیا۔

ملاحظہ ہو۔ ایک کافر و مشرک قوم کو حضرت نوحؑ کی قوم کہا جا رہا ہے۔ نوح علیہ السلام کی قوم آخر آخر وقت تک مشرک رہی اور ایمان نہ لائی۔ لیکن اس کا کفر و شرک اُسے حضرت نوحؑ کی قوم ہونے سے نہ روک سکا۔ ایک پیغمبر اور کافروں کے ایک گروہ کو ایک واحد قوم قرار دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کو مذہب کی بنا پر اس قوم کا رکن نہ کہا بلکہ یقینی وطنیت اور نسل کی بنا پر۔

اشتراکِ زبان کی بنا پر پیغمبروں اور کافروں کو ایک 'قوم' گردانتے ہیں:۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ (ابراہیم) — اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا لیکن اس کی قوم کی زبان میں۔

جس قوم میں رسول بھیجا گیا وہ یقینی کافر و مشرک قوم ہو گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ ایسے ہی انبیا بھیجتا ہے جو اس کافر قوم کے رُکن ہوں اور اپنی 'قومی زبان' میں بات چیت کرتے ہوں۔ یہاں زبان کے اشتراک کی بنا پر ایک نبی کو اس کی کافر قوم کا فرد کہا گیا۔

ایک اور آیت میں حضرت موسیٰؑ کو ان کی "قوم" (جو کہ یقینی کافر تھی) سے نسبت دی گئی۔

فَمَا اٰمَنَ لِمُوْسٰۤى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ (یونس) — موسیٰ پر ایمان نہیں لائے لیکن اُن کی قوم کے کچھ افراد۔

یہاں یہ بھی ملاحظہ فرمایئے کہ کافر و مومن ایک ہی قوم کے افراد ہیں اور یہ صرف وطنیت، نسل اور زبان کی بنا پر۔ باری تعالیٰ حضرت موسیٰؑ اور اِن کی کافر و مشرک قوم کو ایک 'قوم' فرماتا ہے۔

حضرت ہود علیہ السلام کی نسبت ارشاد ہوتا ہے۔

اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ (ہود) — بیشک عاد نے اپنے رب کا انکار کیا، بیشک پھٹکار ہے عاد پر جو قوم تھی ہود کی۔

غور فرمائیے کہ قوم عاد پر خدا کی پھٹکار ہو رہی ہے کیونکہ وہ حضرت ہودؑ کے ہم مذہب نہیں بلکہ منکر اور گمراہ ہیں۔ لیکن پھر بھی انھیں خداوند تعالیٰ اپنے پیغمبر ہی کی قوم شمار کرتا ہے اور "قوم ہود" ہی کہتا ہے۔ یہ قومیت یقینی۔ وطنیت نسل یا زبان کی بنا پر تھی۔ اگر مذہب کی بنا پر قومیت ہوتی تو خداوند تعالیٰ قوم ہود نہ فرماتا۔ ایک اور آیت ملاحظہ ہو۔

وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ	اے قوم میری، ضد میں وہ کمائی نہ کر جس کی وجہ
اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ	سے تجھکو اُس (عذاب) سے سابقہ پڑ جائے جس سے
نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ	قوم نوح، قوم ہود، قوم صالح کو سابقہ پڑا اور قوم لوط
وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ	کا انجام تو تم سے کچھ دور نہیں۔

قوم نوحؑ، قوم ہودؑ، قوم صالحؑ اور قوم لوطؑ۔ یہ تمام قومیں مشرک تھیں۔ لیکن پھر بھی اُنھیں جلیل القدر انبیا ہی کی قوم کہا گیا۔ صرف اس بنا پر کہ ان انبیار اور اُن قوموں کے درمیان وطنی، نسلی یا لسانی رشتہ تھا۔ ان کا پیغمبر ہونا انھیں ایک کافر قوم کے فرد ہونے میں مانع نہ ہوا۔

خداوند قدوس حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں مخاطب کرتا ہے۔

"کہ یہ غیب کی خبریں ہم تم کو بتاتے ہیں کہ اس کے قبل ان خبروں سے نہ تم واقف تھے نہ تمہاری قوم" (قرآن کریم)

کیا حضرت صلعم کی یہ قوم ساری کی ساری مسلمان تھی؟ ہرگز نہیں ان میں زیادہ تر مشرک تھے لیکن پھر بھی وطنیت اور نسب کی بنا پر انھیں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کہا جاتا ہے۔

حدیث شریف سے

مندرجہ بالا احکام الٰہی سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلام کے نزدیک کافر و مومن کی قومیں مل جُل کر ایک متحدہ قومیت بنا سکتی ہیں اور متحدہ قومیت کے لئے تمام اجزا کا ہم مذہب ہونا لازمی نہیں، بلکہ وطن، زبان، یا نسل کی بنا پر قومیتیں بن سکتی ہیں۔ بیجا نہ ہوگا اگر یہاں حدیث نبوی سے بھی چند اقوال نقل کریں۔

حضرت رسول اکرمؐ طائف تشریف لیجاتے ہیں۔ کفار آپ پر پتھروں کی بارش کرنے لگتے ہیں،

جس سے حضور کا پائے مبارک خون سے رنگین ہو جاتا ہے۔ حضور ان کی بابت خدا سے دعا فرماتے ہیں :-

اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِي فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ   اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے وہ میرا

رتبہ نہیں جانتے اسی لئے ایذا پہنچاتے ہیں۔

حضرتؐ نے انھیں "میری قوم" کیوں کہا۔ وہ کافر و مشرک تھے، خدا کے نبی کو ایذا پہنچا رہے تھے پھر بھی اُن کے لئے آپکی زبان مبارک سے 'میری قوم' کا لفظ کیوں نکلا؟ صرف اس لئے کہ وہ آپکے ہموطن یا ہم النسب تھے۔

اسی طرح اُحد میں بھی حضور نے کافروں کو ہم وطن ہونے کی بنا پر میری قوم فرمایا۔ آپ کا مشہور قول **حب الوطن من الایمان** زبان زد خاص و عام ہے۔ حضور کو مکہ سے اس قدر الفت تھی کہ مکہ چھوڑتے وقت آپکی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے۔

اے مکہ! تو مجھکو دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ مگر کیا کروں تیرے باشندے مجھکو یہاں رہنے نہیں دیتے   (حدیث شریف)

ہم وطنوں کی محبت ملاحظہ کر چکے۔ اب وطن کی محبت ملاحظہ ہو۔ حضور وطن کو دنیا میں سب سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر حب الوطنی اور وطنیت کی کونسی دلیل ہو سکتی ہے۔ کیا قوم پرور مسلمان ہندستان کو اس سے کچھ زیادہ کہتے ہیں۔

ایک فرد میں مختلف حیثیتوں کا اجتماع

انسب ہوگا اگر ہم یہاں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ معاہدہ پیش کریں جو آپنے اپنی رسالت کے چودہویں سال مدینہ کے مسلموں اور غیر مسلموں کو ملا کر ایک متحدہ قومیت بنانے کیلئے کیا۔ اس معاہدہ کے بعض دفعات ہم مولانا انور شاہ صاحب مرحوم کے حوالے سے درج کرتے ہیں۔ اس عہد نامے کی رو سے یہ طے پایا کہ مشروطہ امور میں مدینے کے مسلمان اور یہود دشمنوں کے مقابلے میں ایک متحدہ قوم ہوں گے۔ لیکن ہر ایک اپنے اپنے مذہب میں آزاد ہوگا۔ معاہدے کی بعض دفعات کا ترجمہ یہ ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ یہ محمد رسول اللہ کی طرف سے ایک معاہدہ ہے جو مسلمانان قریش مسلمانان مدینہ اور ان لوگوں کے درمیان نافذ ہوگا جو مذکورہ جماعتوں کے ساتھ متفق و حلیف بن گئے ہیں

دفعہ۔ یہ تمام معاہد جماعتیں (قریشی مہاجرین، انصار، یہود) دوسری غیر مسلم غیر معاہد

جماعتوں کے مقابلہ میں ایک جماعت اور ایک قوم شمار ہونگی۔

دفعہ ۱۵ یہود بنی عوف مسلمانوں کے حلیف اور معاہد ہیں۔ یہود اپنے مذہب کے پابند رہیں گے اور مسلمان اپنے مذہب کے۔ مذہب کے سوا باقی امور میں مسلمان اور یہود بنی عوف ایک جماعت شمار ہوں گے۔

مختصر یہ ہے کہ اختلاف مذہب کے باوجود حضرت صلعم نے وطنی معاملات کے نظم و نسق کیلئے اور دشمنوں سے مقابلہ کرنے کیلئے یہودیوں، نصرانیوں اور مسلمانوں کو ملا کر ایک قوم بنایا۔ اب یہ امر غور طلب ہے کہ اگر اسلام میں اتنی لچک موجود نہیں کہ اس کے پیرو دنیاوی امور میں غیر مسلموں سے مل کر ایک قومیت بنائیں تو آپ نے یہودیوں سے مل کر یہ امت متحدہ (معاہدے کی عربی عبارت میں قوم نہیں بلکہ امت کا لفظ آیا ہے) کس طرح بنائی اور اگر غیر مسلموں سے قومی اتحاد کرنے میں اسلام خطرہ میں آجاتا ہے تو اس وقت جبکہ اس مذہب کا ابتدائی زمانہ تھا حضرت نے یہ خطرہ کیوں نہ محسوس کیا۔ معاہدہ میں صاف صاف تشریح کردی گئی کہ مسلمان اپنے مذہب کی پیروی کریں اور یہود اپنے مذہب کی۔ دونوں اپنے اپنے مذہب کے پابند رہتے ہوئے دنیوی معاملات میں قومی بھائی بن کر رہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن نے 'قوم' کا لفظ ایسے گروہوں کیلئے استعمال کیا جن میں کافر و مومن دونوں ہی تھے اور یہ صرف اس بنا پر کہ ان کے درمیان وطنیت، نسب، یا زبان کا رشتہ موجود تھا۔ جلیل القدر پیغمبر ان کو 'کافر' قوموں کا فرد کہا گیا۔ صرف اس بنا پر کہ وہ ان کافروں سے نسلی یا وطنی رشتہ رکھتے تھے ایک جگہ قارون کو، جو کہ مشرک تھا، موسیٰ کی قوم کا ایک فرد تبلایا گیا ہے اِنَّ قَارُوْنَ کَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسیٰ فَبَغیٰ عَلَیْهِمْ (قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا پر وہ ان پر ظلم کرنے لگا) خود حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال و اقوال سے ظاہر ہے کہ آپ نے نسبی وطنی اور لسانی تعلقات کی بنا پر اپنے کو قریش کہا اور اپنے غیر مسلم ہموطنوں سے مل کر ایک قومیت بنائی۔

بہر حال متحدہ قومیت کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر ان آیات و احادیث کی روشنی میں صاف ہو جاتا ہے اور ہندستانی فرقہ پرست مسلم لیڈروں کے اس دعوے میں کوئی جان نہیں رہتی کہ ہندستان کے مسلمان اور غیر مسلم اختلاف مذہب کی بنا پر مل کر ایک قومیت نہیں بنا سکتے

وطنیت کی تائید میں اسلام کے مندرجہ بالا احکام رہتے ہوئے بھی پنجابی صاحب اور ان کی جماعت کا یہ کہنا کہ "مسلمان نسلی انس و محبت اور حب وطنی کے جذبات سے بالاتر ہیں" یقینی ملک کے اندر ایک خطرناک صورت حال پیدا کرنا ہے۔ انسان کے فطری جذبات کو مذہب کا نام استعمال کرکے دبانے کا نتیجہ ہمیشہ تباہ کن ہوتا ہے۔ جن چیزوں کے متعلق قرآن پاک میں صاف احکام موجود ہیں انھیں مسخ شدہ شکل میں پیش کرکے انسان کو وطنی آزادی کے جائز حق سے محروم رکھے رہنا اسلام کی خدمت نہیں بلکہ اسلام کی جڑ کھودنا ہے۔ اتنا ہی نہیں مسلم لیگ کے فلسفی مولانا مودودی اپنی تصنیف کے آخر میں فرماتے ہیں۔

"بعض لوگ اس خیال خام میں مبتلا ہیں کہ وطنی یا نسلی قومیت کے احساسات پیدا ہونے کے بعد بھی اسلامی قومیت کا رشتہ مسلمانوں کے درمیان باقی رہ سکتا ہے ....

لیکن یہ محض جہل اور قلت فکر کا کرشمہ ہے۔ جس طرح خدا نے ایک سینے میں دو قلب نہیں رکھے اسی طرح ایک قلب میں دو قومیتوں کے متضاد اور متصادم جذبات کو جمع کرنے کی بھی گنجایش نہیں رکھی ہے۔ (مسئلہ قومیت صفحہ ٣٤)

کس قدر لغو دلیل ہے۔ انسان کے دل میں بیک وقت متعدد قسم کے جذبات ہو سکتے ہیں۔ انسان کی زندگی متعدد خانوں میں منقسم ہوتی ہے اور ہر خانے کا دائرہ اپنی ایک جدا حیثیت رکھتا ہے۔ یہ دائرے آپس میں ٹکراتے نہیں بلکہ آسمانی کروں کی طرح اپنی اپنی جگہ گردش کرتے رہتے ہیں۔ انسان کی زندگی اور اس کے فرائض اس کے گھر سے شروع ہوتے ہیں اور پھر ساری دنیا میں پھیل جاتے ہیں۔ پہلا دائرہ' خاندان کا ہوتا ہے، خاندان کے دائرے کے بعد پڑوس اور محلہ کا دائرہ ہوتا ہے۔ پھر اپنے شہر یا گاؤں کا۔ پھر سارے وطن اور ملک کا۔ اس کے بعد سارے عالم انسانیت کا۔ اور ان سب دائروں پر محیط وہ دائرہ ہے جو خدا اور انسان کے درمیان ہوتا ہے۔ یہ تمام فرائض یا دائرے اپنی اپنی جگہ رہتے ہیں اور حسب تناسب ان سب کے لئے انسان کے دل میں جگہ ہوتی ہے۔ یہ کہنا کہ وطنیت کے دائرے میں آنے کے بعد ایک مسلمان اسلامی ملت کے رشتے سے نکل جاتا ہے یا اسلامی ملت کے دائرے میں آنے سے وطنیت کے دائرے سے نکل جاتا ہے ایک بالکل لغو بات ہے اس کی مثال تو ایسی ہے کہ ایک شخص اپنے سردار (جسکی ماتحتی میں وہ کام کرتا ہو) اور اپنے باپ دونوں کا فرمانبردار نہیں ہو سکتا۔ یا یہ کہا جائے کہ ایک شخص اپنے سردار اور خداوند تعالی، دونوں کی بندگی بیک وقت نہیں کر سکتا۔

دونوں چیزیں جدا جدا ہیں ۔ انسان بیک وقت کسی کا باپ کسی کا بیٹا کسی کا خاوند کسی کا داماد کسی کی رعایا، کسی کا مُرید، کسی کا پیر اور کسی کا ماتحت ہوتا ہے اور ہر ایک کے فرائض جُدا جُدا ادا کرتا ہے ۔ پھر ایک ہی شخص مختلف انجمنوں کا کارکن ہوتا ہے اور ہر ایک کی ذمہ داریاں علیٰحدہ علیٰحدہ انجام دیتا ہے مذہب اپنے وطن کی محبت اسکی حفاظت اور اسے دشمنوں سے بچانے کیلئے منع نہیں کرتا اور نہ وطنیت کا یہ تقاضا ہے کہ انسان اپنے مذہب کو چھوڑ بیٹھے ۔ مولانا محمد علی مرحوم نے گول میز کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا ۔

"اگر اسلام کا سوال آجائے تو میں اوّل مسلمان ہوں، دوئم مسلمان ہوں، اور آخر مسلمان ہوں، اور سوائے مسلمان کے کچھ نہیں اور اگر ہندوستان کا مسئلہ درپیش ہو تو میں اوّل ہندوستانی ہوں، دوئم ہندوستانی ہوں، آخر ہندوستانی ہوں اور ہندوستانی کے سوا کچھ نہیں"

کتنا معقول جواب ہے ۔ ایک سچا ہندوستانی ہونا اور ایک سچا مسلمان ہونا یقینی متضاد چیزیں نہیں اِن کو متضاد کہنے کا مطلب تو یہ ہے کہ ایک سچا مسلمان وہی ہو سکتا ہے جو وطن سے غداری کرے ۔ اسلام ایک بہت بڑا دائرہ ہے، اس دائرے کے اندر ایک چھوٹا دائرہ وطنیت کا ۔ اگر ہم سے کوئی پوچھے کہ تم کس دائرے میں ہو تو ہم صاف جواب دیں گے کہ ہم دونوں دائرے میں ہیں ۔ جس طرح ایک بڑا دائرہ 'حیوان' کا ہے اس کے اندر ایک چھوٹا دائرہ انسان کا ہے اور ہم دونوں میں ہیں ۔

یورپ میں دہریت کیوں پھیلی

آج سارے ہندوستان میں اس کا رونا رویا جا رہا ہے کہ نوجوان مسلم طبقے میں بیدینی والحاد زوروں پر پھیل رہا ہے لیکن وہ اس کے اسباب پر غور نہیں کرتے ۔ اس کا سبب ڈھونڈھنے کیلئے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ۔ خود اس مذہبی طبقے کے اعمال و اقوال میں مل جائیگا جو ہر ترقی کو مذہب کا نام استعمال کر کے روکنا چاہتا ہے ۔ ہندوستان پر عرصے سے ایک اجنبی حکومت حاوی ہے اور ملک کا خون چوس رہی ہے، اس نے سارے ملک اور خاص کر مسلمانوں کو کنگال اور دلدّر بنا رکھا ہے ۔ ملک میں بیکاری، جہالت، بیماری، سیلاب کا دورہ دورہ ہے ۔ ۳۵ کروڑ کی ایک عظیم الشان قوم کو جو اپنا شاندار ماضی رکھتی ہے، اور موجودہ دنیا میں شاندار کارنامے انجام دے سکتی ہے، ایسے بڑھنے، پھیلنے اور اظہار کا موقع نہیں مل رہا ہے ۔ قدم قدم پر اس کی خود داری کو ٹھیس لگتی ہے

لیکن اگر مسلمان نوجوان ہندو برادران وطن سے مل کر اس ظالم وجابر حکومت کی جڑ کھودنا چاہتے ہیں تو اُن سے یہ کہا جاتا ہے کہ یا تو تم مسلمان رہو، یا ہندوستانی ہو جاؤ، اور اسلام کے دائرے سے نکل جاؤ۔ اس کا مطلب یقینی یہی ہے کہ یا تو تم آزاد ہو یا مسلمان رہو۔ یعنی اسلام اور آزادی دو متضاد چیزیں ہیں۔

کتنا بڑا ظلم ہے جو چیز ازل سے انسان کی فطرت میں داخل ہے اور جسے اسلام نے فرض قرار دیا ہے، اُسے مذہب کے نام پر روکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ فرقہ پرور مبلغین اسلام کی اولین جدوجہد اور عرب مشرکین کے ساتھ مسلمانوں کے رویئے کو ہندوستان کے حالات پر منطبق کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ اِس زمانے کے عرب کے حالات بالکل مختلف تھے۔ عرب، ہندوستان کی طرح کسی اجنبی قوم کا ملک نہ تھا۔ اگر عرب کسی دوسری طاقت کا غلام ہوتا تو حضرت ؐ سب سے پہلے اپنے وطن اور اپنی قوم کو غلامی سے آزاد کرا لیتے اور اس کے بعد اسلام کی تبلیغ کرتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سب سے پہلے یہ حکم ہوا کہ پہلے تم اپنی قوم کو فرعون کے پنجے سے چھڑاؤ۔ غور فرمائیے نبی مبعوث کئے جاتے ہیں لیکن چونکہ ان کی قوم بنی اسرائیل (جو کہ کافر و مشرک تھی) غلام ہے اس لئے دین کی تبلیغ ملتوی کر دی جاتی ہے، اور پہلے آزادی کی جدوجہد شروع کی جاتی ہے۔ لیکن اگر انہی صورتِ حالات میں جدوجہد آزادی میں ہم قدم بڑھانا چاہتے ہیں تو ساحرین برطانیہ کے یہ فلسفی ہمیں اسلام سے خارج کر دینا چاہتے ہیں۔ آخر اِس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ترکی میں مذہب سے جو بیزاری پائی جاتی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ فقہائے دین، ہر ترقی و آزادی کی جدوجہد کے سنگِ راہ ہو گئے تھے۔ رہبرانِ دین نے اُن پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا، ترکی قوم یورپ میں رہتے ہوئے بھی زمانۂ وسطیٰ کی ایک قوم معلوم ہوتی تھی اور اس سے ہر قسم کی ترقی مذہب کے نام پر روک رکھی گئی تھی۔ قوم میں انتہائی مفلوک الحالی تھی اس پر حماقت یہ کی کہ جرمنی کے ساتھ اتحادیوں کے خلاف میدان جنگ میں کود پڑے اس سے اور بھی بدحالی بڑھی۔ انتہا تو یہ ہوئی کہ جب اتحادیوں نے ملک پر دھاوا بول دیا تو حضرت خلیفۃ المسلمین وطن کو اغیار کے ہاتھوں بیچ دینے کیلئے تیار ہو گئے۔ ایک طرف مصطفےٰ کمال یونانیوں سے برسرپیکار تھے، اور دوسری طرف خلیفہ صاحب اتحادیوں سے مصالحت کی گفتگو فرما رہے تھے۔ کمال کو کافر اور دہریہ مشہور کیا گیا۔ آخر یہ صورتِ حال ترک برداشت نہ کر سکے۔ انھوں نے خلیفہ کے مقابلہ میں کمال کا ساتھ دیا۔ سیاسی طاقت ہاتھ میں آنے کے بعد کمال نے "خلافت" کے نظام کو

ختم کیا اور اعلان کر دیا کہ اب سے ترکی کوئی مذہبی اسٹیٹ نہ رہا، بلکہ اس کا صدر ایک نصرانی یہودی بھی ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ ترکی قوم کا فرد ہو۔ یعنی ترکی کی حکومت کی بنیاد مذہب پر نہیں بلکہ قومیت پر رکھی گئی۔

ہندستان میں بھی یہی صورتِ حال پیدا کی جا رہی ہے۔ وطن کی آزادی اور تمام ترقیوں کو 'اسلام' کے نام پر روکا جا رہا ہے۔ اور اس طرح مذہب کی آڑ میں شہنشاہیت کی مدد کی جا رہی ہے یہ صورتِ حال زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کی جا سکتی۔ انسان کو اس کے جائز اور فطری حقوق سے مذہب کے نام پر بھی زیادہ دنوں تک روکا نہیں جا سکتا۔ یقینی یہ صورت ایک دن ناقابلِ برداشت ہو جائیگی اور مسلمان ان تمام نمائندے غلامی کو وہی جواب دیں گے جو ترکی میں دیا گیا۔ ترک علماء نے بھی اسی طرح مسلمانوں کو سامنے دو صورتیں رکھدی تھیں۔ "وطنیت یا اسلام" لیکن ترکوں نے اوّل الذکر شکل اختیار کی جو اسلام کے عین مطابق تھی، مگر ان مُفتیان غلامی کے جھوٹے اسلام کے دعاوی کے متضاد

وطنیت کیخلاف ایک زبردست دلیل یہ پیش کیجاتی ہے کہ اسی کے سبب یورپ میں دہریت پھیلی اور جب سے قومیت NATIONALISM کا یورپ میں دور دورہ ہوا یورپ لامذہب ہوگیا۔ لیکن جن لوگوں نے حالات کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کے اسباب کیا تھے۔
یورپ میں دہریت پھیلنے کا اصل سبب 'پوپ' ہے جس نے مسیحیت کو غلط شکل میں پیش کیا۔ کلیسا نے بلا استثنار ہمیشہ ظالموں کا ساتھ دیا اور جب کبھی مظلوموں نے سر اٹھایا تو لامذہبیت کا ہوّا دکھا کر انھیں دبا دیا۔ وہ بڑے امیر و کبیر تھے، ہر کلیسا میں بڑی بڑی جائدادیں وقف تھیں اور کلرجی عیش و عشرت میں ڈوبے رہتے تھے۔ وہ مذہب، سیاست اور زندگی کے ہر شعبے پر حاوی تھے۔ گرجے کے رسوم و رواج بھی بالکل مضحکہ خیز ہو کر رہ گئے تھے۔ وہاں ایک شخص لوتھر پیدا ہو گیا۔ اور اس نے اس بناوٹی مسیحیت کو چیلنج دیا۔ یورپین قومیں ترقی کرنا چاہتی تھیں اور پوپ انھیں ان کے جائز حق سے روکتا تھا، جس طرح آج ہمارے فرقہ پرور بھائی ہمیں ہمارا جائز حق دینا نہیں چاہتے۔ ان بیچاروں کے سامنے اس مصیبت سے نکلنے کا سوا اس کے کوئی راستہ نہ رہا کہ وہ مسیحیت کا خاتمہ کر دیں۔ اور یہی ہوا۔
ایک عالمگیر نظام قوموں کی عصبیت کو مٹانے سے نہیں بلکہ انھیں قائم رکھنے اور پالنے

سے زندہ رہ سکتا اور بڑھ سکتا ہے۔ اگر کوئی ایسا مذہبی یا سیاسی نظام اپنے مختلف عناصر کو اِن کی عصبیت قائم رکھنے اور اپنے طور پر ترقی کرنیکا جائز حق نہیں دیتا تو وہ مٹ جاتا ہے رومن ایمپائر کا یہی حال ہوا۔ خلافت کا بھی یہی نتیجہ ہوا۔ خلافت راشدہ کے خاتمے کے بعد خلافت ایک خاندانی مذہبی شہنشاہیت ہوکر رہ گئی تھی۔ ایک قوم کی حکومت مختلف قوموں پر ہونے لگی۔ اور ایک قوم کی عصبیت دوسری قوموں پر چھانے لگی۔ دوسری قومیں اِسے برداشت نہ کرسکیں اور وہ ایک ایک کرکے اِس نظام سے علیحدہ ہونے لگیں۔ ان خلفا نے دوسری قوموں کی عصبیت کو مٹانے اور ان کے جائز حقوق آزادی سے محروم رکھنے کی کوشش کی۔ کچھ دن ہوئے ترکی خلافت نے اپنی عصبیت سے مغلوب ہوکر فلسطین عرب قوم کی عصبیت کو پامال کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ باغی ہوگئے اور انگریزوں کے ہاتھ لگ گئے۔ ہندستان کے تمام سلاطین اسلام نے خلیفہ سے کبھی کوئی سیاسی رشتہ نہ رکھا۔ اورنگ زیب جیسے مذہبی بادشاہ بھی خلیفہ کی اطاعت قبول نہ کی۔ اگر قبول کرتے تو شاید انھیں بھی محمد بن قاسم کی طرح (جسے داہر راجہ سندھ کی لڑکیوں کے کہنے پر حجاج نے مرواڈالا تھا) خلیفۃ المومنین کسی کے کہنے سننے پر بھینس کی کھال میں لپیٹ کر گھوڑے کی ٹاپوں کے نیچے روندا دیتے۔ رومن شہنشاہیت ROMAN EMPIRE نے مذہب کے نام پر سب کچھ کیا۔ روس کی موجودہ لامذہبیت کا سبب بھی یہی ہے، کہ زار کے گرگے، کلرجی نے ہمیشہ بادشاہ کا ساتھ دیا اور غربت سے پسی ہوئی عوام کو مذہب کا خوف دلادلا کر غلام بنائے رکھا۔ پھر ایک دن ایسا آیا کہ صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور پھر نہ زار تھا اور نہ اس کے لمبی عبا والے گرگے۔ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں ہندستانی زار کے گرگوں کا بھی یہی حشر نہ ہو۔

آج اگر ہم ہندستان میں تمام عصبیتوں کو مٹا کر متحدہ قوم بنانا چاہیں تو یہ قطعاً ناممکن ہے۔ ہم تو ان کی عصبیت کو قائم رکھ کر اور نہ صرف قائم بلکہ مضبوط کرکے ہی متحدہ قومیت کی بنا ڈال سکتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ آج آزادی مل جائے، اور ہندستان کی آزاد حکومت بنگالی، گجراتی، دکنی، پنجابی، سندھی، آسامی، کشمیری، تامل وغیرہ عصبیتوں کو مٹانا چاہئے تو کیا وہ ایک دن بھی چل سکتی ہے! ہندستان کی صحیح آزادی کا یہی مفہوم ہے کہ یہ تمام عصبیتیں بھی آزاد اور زندہ ہوں اور پھر ایک قومی واحد نظام میں مل کر ترقی کریں۔ اسلامی وحدت قومی وطنی عصبیتوں کو مٹاتی

نہیں بلکہ ان سبھوں میں ایک رشتہ پیدا کرتی ہے۔ قومی عصبیت ایک فطرت ہے، اور فطرت کو مٹانا ناممکن ہے۔ اسلام نہ وطنیت کا دشمن ہے، نہ رنگ کا نہ نسل کا۔ یہ تمام چیزیں حقیقت ہیں اور انھیں اسلام نے مانا ہے، اگر نسلی عصبیت کوئی چیز نہ ہوتی تو حضور رسول اکرمؐ کبھی "الایمة من قریش" نہ فرماتے۔ اسلام ان تمام وطنی اور نسلی رشتوں کے بیچ ایک جوڑنے والا اور ملانے والا رشتہ ہے۔ اگر کسی نے اس سے زیادہ کوشش کی اور اس کے ذریعے دوسری عصبیتوں اور حقوق کو پامال کرنا چاہا تو اس کا نتیجہ وہی ہوگا، جو تاریخ میں ہوا کیا ہے۔

عالمگیر اسلامی رشتے کی ضرورت

مندرجہ بالا استدلال سے غالباً آپ اس نتیجہ پر پہنچے ہوں گے کہ اسلام قومیت یا وطنیت کا مخالف نہیں لیکن اس سے ہمارا یہ مقصود نہیں کہ اسلام تمام عالم اسلامی کو ایک بین الاقوامی رشتے میں جمع کرنے کو نہیں کہتا۔ بیشک کہتا ہے اور ایک مرکزی، سیاسی، اسلامی ادارہ قائم کرنے پر زور دیتا ہے۔ اگر ایک آل ورلڈ مسلم ادارہ بنایا جائے تو یقینی تمام قوم پرست مسلمان اس صدا پر لبیک کہنے کو تیار ہوں گے۔ لیکن کسی ایسے ادارے کے قیام کا خود بیڑا اٹھانا، یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔ جو قومیں آزاد ہیں وہی اس کی ذمہ داری لے سکتی ہیں۔ ہم غلام ہیں اور دعائے خیر کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ دنیا میں خلافت قائم رہی، ادلتی بدلتی رہی اور یہاں تک کہ ختم بھی ہوگئی۔ لیکن اس میں ہمارا کوئی ہاتھ نہ رہا۔ ہم خلافت کے گیت ہی گاتے رہے۔ اور خلافت کا خاتمہ بھی ہوگیا۔ جس طرح اس کے مٹانے میں ہمارا کوئی ہاتھ نہ تھا اسی طرح اس کے قیام میں بھی ہمارا کوئی ہاتھ نہیں ہو سکتا۔ دوسری اسلامی سلطنتیں اس کام کو کریں

لیکن ان اسلامی سلطنتوں کی حالت بھی تو دیکھیے۔ ترکی، عرب، مصر، شام، ایران، افغانستان (اور یہاں تک کہ پنجاب اور بنگال)، یہ تمام اسلامی سلطنتیں آج انگریزوں کے سامنے دست بستہ احکام بجا لانے کیلئے کھڑی ہیں۔ پہلے ان سبھوں کو انگریزی اقتدار سے تو آزاد کرائیے۔ ورنہ اگر اس حالت میں کوئی خلافت قائم ہوئی تو یقینی وہ مسلمانوں کی خلافت کی بجائے انگریزوں کی خلافت ہوگی۔

اسلامی وحدت کے قیام کیلئے مجدد دین اسلام اور علمائے کرام نے کچھ کم کام نہیں کیا۔ علامۃ الجلیل حضرت جمال الدین افغانی نے بڑے شد و مد سے پین اسلامزم یا پاکستان کی تحریک اٹھائی تھی۔ ہندوستان میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رح، مولانا عبید اللہ سندھی اور شیخ الہند مولانا حسین احمد مدظلہ نے اس سلسلے میں کچھ کم جد و جہد نہ کی۔ برسوں قید فرنگ میں گذارے۔ لیکن آخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ پہلے وطن کو آزاد کرانا چاہیئے، چنانچہ یہ تینوں بزرگ وطنی تحریک میں شامل ہوگئے۔ آج مولانا حسین احمد مدظلہ، اور مولانا عبید اللہ سندھی جو ۲۰ سال کی جلاوطنی کے بعد تشریف لائے ہیں۔ ملک کے دوسرے فرقوں سے تعاون کرتے ہوئے آزادی وطن کی تحریک میں پیش پیش ہیں۔ "پاکستان" کے ایک مبلغ علامہ اقبال بھی تھے۔ لیکن انھوں نے اپنے اس تخیل کیلئے کوئی قربانی نہ کی، بلکہ پین اسلامزم یا پاکستان کی راہ میں سب سے بڑی مانع طاقت (برطانیہ) کی حمایت کرتے رہے۔ اور سر کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ اسی طرح، کی ایک اسکیم ترکی میں، مصطفےٰ کمال، انور پاشا اور شیخ سنوسی نے بھی مل کر بنائی تھی، جس کی رو سے شام، ترکستان، فلسطین، چین، ہندوستان، جاوا، حیدرآباد، تونس، الجیریا، کریمیا وغیرہ میں دس آزاد جمہوری اسلامی ریاستیں قائم کرنیکا خیال تھا۔ لیکن اس اسکیم کو بروئے کار لانے کیلئے بیک وقت برطانیہ، فرانس، اطالیہ، روس اور ہالینڈ سے اعلان جنگ کرنا پڑتا۔ مگر ان کی طاقت ان میں سے ایک سے بھی نہ تھی۔ خود اپنا وطن (ترکی) خطرہ میں پڑا ہوا تھا۔ آخر کمال نے اس خیال خام کو خیر باد کہا۔ وہ ایک عملی انسان تھے لیکن انور ایک جذباتی انسان تھے انھیں اس نے بہت اپیل کیا اور وہ اس تخیل میں چمٹے رہے لیکن زمانے نے تبلا دیا کہ دنیا کو جذبات سے زیادہ عمل کی ضرورت ہے۔ کمال کامیاب ہے اور انور ناکامیاب کمال جانتے تھے کہ یہ چیز خیالی پلاؤ اور بالکل ناقابل عمل۔ مصطفےٰ کمال نے اسی وقت یہ بھی محسوس کر لیا کہ دنیا میں موجودہ صورت حال میں مذہبی بنیادوں پر کوئی نظام قائم نہیں ہوسکتا وہ اسلامی وحدت قائم کیا کرتے انھوں نے رہی سہی اسلامی وحدت (خلافت) کو بھی ختم کر دیا۔ کیونکہ اس سے مسلمانوں کو فائدہ کے عوض نقصان پہنچ رہا تھا۔

وحدت اسلامی قائم ہو اچھا ہے لیکن یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ ہم اس خواب کے منتظر رہیں اور آزادی وطن کی جد و جہد سے غافل ہوجائیں۔ یہ لوگ بھی عجب مخلوق ہیں جو یا تو خلافت راشدہ کی حکومت میں رہیں گے یا پھر انگریزوں کی غلامی میں، لیکن اول ایک چیز ناممکن ہے اور دوسری چیز ناقابل برداشت، اسلئے ہمیں ان دونوں کے بیچ بیچ ایک درمیانی راستہ نکالنا چاہیئے اور یہی اعتدال و درمیانہ روی کی اسلام نے تعلیم دی ہے۔

پاکستان کی مختلف اسکیمیں

ابتک پاکستان کی جتنی اسکیمیں ہمارے سامنے آئی ہیں وہ پانچ ہیں (۱) ڈاکٹر عبداللطیف کی اسکیم (۲) علی گڈھ اسکیم (۳) سکندر حیات اسکیم (۴) اسد اللہ اسکیم اور (۵) پنجابی اسکیم۔ ان میں پنجابی کی اسکیم بہت زیادہ مفصل ہے جو ۲۷۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسے نواب سر شاہ نواز خاں (ممدوٹ) نے شائع کیا ہے، جو مسلم لیگ میں ذمہ دارانہ حیثیت کے مالک ہیں۔ یہ کتاب مسلم لیگ کے اجلاس لاہور (اپریل ۱۹۴۰ء) میں ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کی گئی۔ اور غالباً مسلم لیگ کی تحریک (متعلق تقسیم ہند) کی بنیاد بھی یہی ہے۔ لہٰذا اسے مسلم لیگ کی سرکاری اسکیم کہنا چاہیئے۔

یہاں ہم یہ پانچوں اسکیمیں بیان کر دیں گے، لیکن مفصل بحث موجودہ کتاب میں قلت گنجائش کے سبب صرف ایک ہی اسکیم پر ہو سکے گی۔ یہ تمام اسکیمیں بنیادی طور پر ایک ہی ہیں اس لئے ان پر فرداً فرداً بحث کرنا بھی عبث ہے۔ لہٰذا پنجابی اسکیم کے علاوہ جو اسکیمیں ہیں، انھیں ہم صرف ناظرین کے سامنے پیش کر دینے پر اکتفا کریں گے۔ اور اس کے بعد پنجابی کی اسکیم کا تفصیلی مطالعہ کریں گے لیکن اول الذکر اسکیموں میں جو خصوصیات ہوں گی ان پر بھی ہلکی روشنی ڈالتے جائیں گے۔

ڈاکٹر سید عبداللطیف کی اسکیم

اس اسکیم میں ہندستان کو چار مسلم اور گیارہ ہندو ثقافتی حلقوں CULTURAL ZONES میں تقسیم کیا گیا ہے۔

مسلم حلقے

(۱) شمالی مغربی حلقہ۔ اس زون میں پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کے برطانی صوبے ہوں گے اور خیرپور اور بہاول پور کی ریاستیں شامل ہونگی۔

(۲) شمالی و مشرقی حلقہ۔ اس میں مشرقی بنگال اور آسام کا صوبہ ہوگا۔

(۳) دہلی۔لکھنؤ حلقہ۔ یہ علاقہ ریاست پٹیالہ کی مشرقی سرحد سے لیکر رام پور کو احاطہ کرتا ہوا لکھنؤ تک جائیگا اور اس میں آگرہ، دہلی، کان پور، اور لکھنؤ کے شہر ہوں گے۔ ریاست صرف ایک رام پور ہی رہیگی۔

(۴) دکنی حلقہ۔ اس میں ریاست حیدرآباد، اور برار کا صوبہ ہوگا۔ مزید برآں اس حلقے میں کرنال، کوڈاپا، چیتور (CHITTOOR) شمالی آرکوٹ اور چنگل پٹ، کے برطانی اضلاع (جو صوبہ مدراس میں ہیں) شامل کردئے جائیں گے تاکہ اس حلقے کو سمندری کنارہ بھی مل جائے۔

ہندو حلقے

(۱) اِس حلقے میں مغربی بنگال کے وہ اضلاع جو مسلم حلقے سے بچ رہے ہوں، اور بہار کے وہ اضلاع جن میں بنگلہ زبان بولی جاتی ہے، ہوں گے۔

(۲) اڑیسہ۔ جس میں تمام اُڑیا بولنے والے شامل ہوں گے۔

(۳) بہار، اور یو، پی کا حلقہ جو لکھنؤ، دہلی کے مسلم حلقے تک جائیگا اور کوہ ہمالیہ اور اور بندھیا کے درمیان ہوگا، اس میں وسط ہند کی چند ریاستیں بھی شامل ہوں گی۔

(۴) راجپوتانہ کی راجپوت ریاستیں۔

(۵) گجرات اور کاٹھیاوار۔

(۶) مہاراشٹر

(۷) کنارا

(۸) آندھر

(۹) تامل

(۱۰) مالابار اور

(۱۱) شمالی مغربی ہند میں ایک ہندو۔ سکھ بلاک

تبادلۂ آبادی

مصنف اسکیم نے ان مسلمانوں کو جو ہندو علاقوں میں بستے ہیں رائے دی ہے کہ وہ اپنے قریبی مسلم علاقے، میں منتقل ہو جائیں اور اسی طرح جو ہندو، مسلم علاقے میں پڑتے ہیں وہ ہندو علاقے میں چلے جائیں، ہریجنوں کے تبادلے کا سوال ان کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے، تاکہ وہ اپنی خواہش کے مطابق ہندو یا مسلم علاقہ، جس میں وہ رہنا پسند کریں چلے جائیں۔ لیکن یہ تبادلۂ آبادی فوری طور پر نہ ہو بلکہ کئی سال کی مدت میں ہو۔ تاکہ انتظام میں سہولت ہو۔

مرکز

اس اسکیم کا مقصد کلچر کی بنیاد پر متجانس ریاستوں STATES CULTURALLY HOMODENOUS کی ایک احدیہ CONFEDERACY قائم کرنا ہے۔ لیکن فی الحال یہ اسکیم ان تمدنی منطقوں کا ایک کل ہند وفاق FEDERATION قائم کرنا چاہتی ہے اس کی رائے ہے کہ وفاق کی تمام وحدتوں UNITS کو زیادہ سے زیادہ آزادی دی جائے اور صرف ناگزیر معاملات، جیسے دفاع: خارجی حکمت عملی، تجارت، رسل و رسائل وغیرہ وفاق کے سپرد کئے جائیں۔ اس دستور میں دیسی ریاستوں اور ان کے حکمرانوں کے حقوق کو بھی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے تسلیم کر لیا گیا۔

صوبہ یا مرکز کی منتظمہ EXETUTIVE اکثریت مرتب نہ کریگی، جیسا کہ انگلستان کی پارلیمنٹ کا قاعدہ ہے بلکہ ایسی منتظمہ ہوگی جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو ملا کر بنائی جائے گی۔ اگرچہ یہ مجلس منتظمہ مجلس مقننہ ہی منتخب کریگی لیکن یہ مجالس مقننہ کی گرفت سے آزاد ہوگی اور بقول مصنف STABLE EXECUTIVE INDEPENDANT OF LEGISLATURE ہوگی۔ وزیر اعظم اور اس کی کابینہ کو کانسل نکال نہ سکیگی۔

ڈاکٹر عبداللطیف صاحب لکھتے ہیں:۔

"منتخبہ وزیر اعظم صرف مجلس مقننہ کی میعاد میں برسر خدمت رہے گا۔ مگر مقننہ کو اس کی علیٰحدگی کا اختیار نہ ہوگا۔"

(متبادل دستور ہند صفحہ ۱۷)

نمایندگی کا طریقہ جداگانہ انتخاب ہوگا۔ اور تمام صوبوں میں مسلمانوں کی موجودہ تعداد د اسمبلی
میں، علی حالہ قائم رہے گی۔

نقائص

اُن بُنیادی نقائص اور کمزوریوں کے علاوہ جو تقسیم ہند کی تمام اسکیموں میں مشترک ہیں، موجودہ
اسکیم کے مخصوص نقائص درج کرتا ہوں۔

(۱) مندرجہ بالا تقسیم کسی اُصول کی بنا پر نہیں کی گئی اور کئی جگہ نہایت غیر منصفانہ ہے۔ اِس تقسیم میں اُن
مقامات کو بھی مسلم حلقے میں شامل کر لیا گیا ہے، جہاں ہندو اکثریت ہے۔ صوبۂ آسام شمالی مشرقی بلاک میں
شامل نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہاں ۵۷ فیصدی ہندو بستے ہیں اور صرف ۳۰ فیصدی مسلمان۔ ہاں صوبۂ آسام
کا سلہٹ ضلع شامل کیا جاسکتا ہے، جہاں ۵۸ فی صدی مسلمان ہیں۔ پھر دہلی اور لکھنؤ کا علاقہ بھی مسلم حلقے
میں نہیں آسکتا، کیونکہ اِس علاقہ میں ہندوؤں کی بہت زیادہ اکثریت ہے۔ صوبۂ متحدہ میں مسلمان صرف ۱۴ فیصدی
ہیں۔ پھر دہلی میں بھی قریب قریب اسی تناسب میں آباد ہیں، حیدرآباد کسی طرح مسلم حلقے میں نہیں آسکتا
کیونکہ یہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ اگر حیدرآباد صرف اس سبب سے کہ اس کا تاجدار مسلمان ہے مسلم حلقے
میں شامل کیا جاتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ کشمیر کو پاکستان میں رکھا جائے علاوہ اس کے آرکوٹ، چنگل پٹ
اور مدراس میں بھی ہندو اکثریت ہے، صرف اس لئے کہ نظام کو سمندر کا راستہ مل جائے، ہندو اسے
دینے پر رضامند نہ ہوں گے۔ کوئی وجہ نہیں کہ مدراس ایسا بندرگاہ نظام کو دیدیا جائے۔ کلکتہ میں
ہندو اکثریت ہے۔ اِس لئے اسے بھی مسلم حلقے میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔

(۲) تبادلۂ آبادی اس اسکیم کی ایک بنیادی چیز ہے جو بالکل ناقابلِ عمل ہے۔ اگر اسکیم مذکورہ کے
مطابق تبادلہ منظور کیا جائے تو تقریباً بیس کروڑ (۲۰) ہندستانیوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا
پڑے گا۔ اِس بڑے پیمانہ پر تبادلۂ آبادی بالکل ناقابلِ عمل ہے۔ یہ تبادلہ صرف صوبوں کے درمیان
نہیں بلکہ صوبوں اور ریاستوں کے درمیان بھی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ برطانی ہند کا باشندہ، جسے
ریاستوں سے زیادہ شہری آزادی اور سہولتیں حاصل ہیں، ریاستوں کی شخصی حکومتوں میں جانا پسند
کرے۔

اگر انتقال آبادی اختیاری رکھا گیا تو شاید ہی کوئی اپنا وطن چھوڑنے پر راضی ہو، اور اگر جبر فارکھا گیا تو اس سے ملک ایک بے پناہ عذاب میں مبتلا ہو جائیگا۔ تبادلۂ آبادی کے اخراجات حکومت کیلئے ناقابلِ برداشت ہونگے اور کروڑوں نو واردوں کیلئے حکومت روزگار کا بھی انتظام نہ کر سکے گی۔

(۳) مصنفِ اسکیم نے برطانی اقتدار کے ماتحت 'فیڈریشن' مانا ہے۔ جس کا مطلب ہے ملک کی دائمی غلامی۔ علاوہ اس کے ریاستوں کو اس کی شخصی اور دقیانوسی حکومت کے ساتھ علیٰ حالہٖ چھوڑ دیا گیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ چھ کروڑ ہندستانیوں پر یہ شخصی اور ظالمانہ حکومت کی لعنت تا ابد قائم رہے اور وہ کبھی اپنی (جمہوری) حکومت نہ قائم کر سکیں۔

(۴) یہ اسکیم منتظمہ EXECUTIVE کو مجلس قانون ساز LEGISLATVRE کے ماتحت نہیں رکھتی، جس کا مطلب چند اشخاص کی ڈکٹیٹرشپ ہے۔ موجودہ وائسرائے کی (مرکزی) حکومت اور اس حکومت میں کوئی فرق نہیں۔ کیونکہ وائسرائے اور ان کی کانسل مرکزی مجالسِ مقننہ کے آگے اپنے افعال کیلئے جوابدہ نہیں اور اسمبلی انھیں نکالنا چاہے بھی تو نہیں نکال سکتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہندوستان میں جمہوریت کا خاتمہ کر کے تسلطائی FASCIST طرزِ حکومت لانا ہے۔

(۵) یہ کہنا کہ تقسیم کے بعد بھی مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن صوبوں میں قائم رہے ناممکن العمل ہے۔ مسلمانوں کو جو ویٹیج WEIGTAGE اور ملازمتیں ان کے تناسب سے زیادہ ملی ہوئی ہیں وہ ہندو اکثریت کے صرفے پر ہے، اور وہ تقسیم ہند کے بعد قائم نہیں رہ سکتیں۔

(۶) شمالی و مغربی صوبوں کی اس تقسیم سے پنجاب کی بڑی بڑی نہروں کے دہانے ہندو علاقے میں رہ جاتے ہیں۔

علیگڈھ اسکیم

اس اسکیم کے مصنف علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے دو پروفیسر سید ظفر الحسن اور افضل حسین قادری ہیں۔ یہ اسکیم سارے ہندستان کو متعدد حصّوں میں بانٹتی ہے جس کا ہر حصّہ مکمل طور پر ایک سلطنت ہوگا اور تمام معاملات میں آزاد ہوگا تقسیم اس طور پر ہوگا۔

۱- پاکستان

اس میں پنجاب، صوبۂ سرحد، سندھ اور بلوچستان کے برطانی صوبے ہوں گے اور کشمیر (مع جموں) منڈی، چمبا، سکیت، سیمبر، فرید کوٹ، نابھ، جھند، پٹیالہ، کپورتھلہ، مالیر کوٹلہ، چترال، دیر، قلات، لوہارو، بلاس پور، بھاولپور اور شملہ کی پہاڑی ریاستیں ہوں گی۔

مجموعی آبادی - ۳ کرور ۹۲ لاکھ۔ مسلمان ۲ کرور ۳۶ لاکھ۔ مسلمانوں کا تناسب ۶۰ فی صدی -

۲ - بنگال

اس میں صوبۂ بنگال (ہاوڑا اور مدنا پور کے اضلاع کے ماسوا) آسام کا سلہٹ ڈویزن، اور بہار کا پورنیہ ضلع ہوگا۔

مجموعی آبادی - ۵ کرور ۲۵ لاکھ - مسلمان ۳ کرور ۱ لاکھ - مسلمانوں کا تناسب ۵۷ فیصدی -

۳- ہندستان

اس میں ہندستان کے بقیہ تمام حصّے اور ریاستیں (حیدر آباد، پاکستان، بنگال، اور بنگال کی ریاستوں کے ماسوا) شامل ہوں گی -

مجموعی آبادی - ۲۱ کرور ۶۰ لاکھ - مسلمان ۲ کرور ۹ لاکھ - مسلمانوں کا تناسب ۹ فی صدی -

۴- حیدر آباد

اِس سلطنت میں ریاست حیدر آباد، صوبۂ برار، اور کرناٹک (جس کے کچھ اضلاع مدراس سے لینے پڑیں گے اور کچھ اڑیسہ سے) شامل ہوگا۔

مجموعی آبادی - ۲ کرور ۹۰ لاکھ - مسلمان ۲۱ لاکھ - مسلمانوں کا تناسب ۷ فی صدی -

۵ - دہلی

اس میں صوبۂ دہلی، اور صوبۂ متحدہ کا میرٹھ ڈویزن اور روہیلکھنڈ ڈویزن، اور

علی گڑھ کا ضلع ہوگا۔

مجموعی آبادی۔ ا کرور ۲۶ لاکھ۔ مسلمان ۳۵ لاکھ۔ مسلمانوں کا تناسب ۲۸ فی صدی۔

۶۔ مالابار

اس سلطنت میں مالابار کا صوبہ اور جنوبی کنارا ہوگا۔

مجموعی آبادی۔ ۹۴ لاکھ۔ مسلمان ۲۴ لاکھ۔ مسلمانوں کا تناسب ۲۷ فیصدی۔

۷۔ آزاد شہر

ہندستان میں جتنے شہر ۵۰ ہزار یا اس سے زیادہ آبادی رکھنے والے ہوں گے انھیں آزاد شہر (FREE CITY) کا درجہ دیا جائے اور وہ بطور خود ایک سلطنت کی مانند آزاد ہوں۔ ان آزاد شہروں میں مجموعی طور پر تقریباً ۱۳ لاکھ مسلمان ہوں گے۔

مرکز

مرکز کی مشینری کے متعلق پروفیسر صاحبان کوئی صاف چیز نہیں پیش کرتے۔ بہر حال آپ فرماتے ہیں کہ مندرجۂ بالا ہر ایک ریاست تمام معاملات میں "مکمل طور پر آزاد" ہوگی اور اسے کامل سروری (SOVEREIGNTY) حاصل ہوگی۔ کوئی مرکزی حکومت ان کے اوپر حکمراں نہ ہوگی۔ ہاں یہ تینوں ریاستیں حکومت برطانیہ کے ماتحت ہونگی اور شہنشاہ برطانیہ سے ان تینوں کے علٰحدہ علٰحدہ معاہدے ہونگے، اور ان میں تاج کے تین علٰحدہ علٰحدہ نمایندے رہیں گے۔ پھر یہ تینوں ریاستیں آپس میں ایک مدافعانہ و جارحانہ اتحاد (OFFENSIVE AND DEFENSIVE) کریں گی جس کی بنیاد یہ ہوگی:۔

(۱) ایک دوسرے کی حکومت کو تسلیم کرنا اور ایک دوسرے کو ہر طرح کی مراعات و سہولتیں بہم پہونچانا۔ (۲) پاکستان اور بنگال مسلمانوں کا وطن (HOMELAND) قرار دیا جائے اور ہندستان ہندوؤں کا، جس میں وہ اپنی مرضی کے مطابق جب چاہیں منتقل ہو جائیں۔ (۳) ہندستان میں جو مسلمان رہ جائیں انھیں پاکستان اور بنگال کی بڑی قوم کا جزو

سمجھا جائے اور ان سے ویسا ہی سلوک کیا جائے (۴) پاکستان کی ہندو اقلیت اور ہندستان کی مسلم اقلیتوں کو یہ حقوق ملیں گے (الف) تناسبِ آبادی کے مطابق نمایندگی (ب) جداگانہ انتخاب (۵) اور ایک مستند سیاسی جماعت کو ہندو ہندستان کی مسلم اقلیت کی نمایندگی کا حق ہوگا۔

نقائص

(۱) پاکستان میں مشرقی پنجاب (انبالہ ڈویژن، جالندھر ڈویژن، اور امرتسر کا ضلع) کے بارہ ضلعے ایسے شامل کر لئے گئے ہیں جن میں ہندوؤں اور سکھوں کی اکثریت ہے اور مسلمان اقلیت میں ہیں۔ ان بارہ اضلاع میں ۴۴ لاکھ ہندو، ۱۸ لاکھ سکھ اور ۲۹ لاکھ مسلمان ہیں۔ بنگال میں بردوان ڈویژن اور پریسیڈنسی ڈویژن کے دس ضلعوں کو خواہ مخواہ مسلم علاقے میں رکھا گیا ہے ان دونوں کمشنریوں میں ایک کروڑ ۲۳ لاکھ ہندو اور ۶۰ لاکھ مسلمان ہیں یعنی ان اضلاع میں ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے دوگنی ہے۔ اسی طرح بہار کے پورنیہ ضلع کو شامل کرنا بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ اس میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۴۰ فیصدی اور ہندو کا ۵۸ فی صدی ہے۔

(۲) ہندستان کے تمام شہروں کو جن میں پچاس ہزار یا اس سے زیادہ کی آبادی ہے، آزاد شہر (FREE-CITY) قرار دیدیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان شہروں کیلئے ہندستان میں ہمیشہ خانہ جنگی ہوتی رہے۔ آزاد شہروں کا یورپ میں جو نتیجہ ہوا وہ ہر شخص کو معلوم ہے۔ موجودہ جنگ ڈینزگ ہی کے آزاد شہر سے شروع ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں یہ چھوٹے چھوٹے شہر اپنی مدافعت بھی نہیں کر سکتے۔ اتنی بڑی تعداد میں ملک کے اندر آزاد شہر پیدا کر دینا بہت زیادہ خطرناک ہے۔ علی گڈھ اسکیم ہندستان کو صرف چند حصوں میں نہیں بلکہ سینکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔

(۳) مسلم اقلیت کے مسئلے کا اس میں کوئی حل موجود نہیں۔ تقریباً ۳ کروڑ مسلمان پھر بھی ہندو ہندستان میں رہ جاتے ہیں۔

(۴) مسلم اقلیت جو ہندستان میں رہ جاتی ہے ان کے متعلق مصنّفینِ اسکیم یہ کہتے ہیں کہ ہندوؤں کو انھیں پاکستان کی ایک بڑی ملت کا جزو سمجھنا چاہئے، لیکن وہ پاکستان کی ہندو اقلیت کو ہندستان کی ایک بڑی ہندو جاتی کا حصّہ قرار نہیں دیتے۔

(۵) حیدر آباد کو دوسرے حصّوں سے زیادہ آزادی دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے اور نیپال کے مساوی بنا دینے کا خیال ظاہر کیا گیا ہے، جو یقینی دوسری قوموں کیلئے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ علاوہ اس کے برار اور کرناٹک کے ہندو علاقوں کو حیدر آباد کی ریاست میں کس بنا پر ملا دیا جائے، اور اسے ہندو کیوں منظور کریں گے اس کی

کوئی دلیل نہیں پیش کی گئی۔

(۶) یہ اسکیم ہندستان، پاکستان اور بنگال تینوں کیلئے برطانیہ سے علیحدہ علیحدہ معاہدے کرتی ہے جس کا مطلب دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ ہندستان برطانیہ کے رحم وکرم پر رہ جاتا ہے اور جس طرح انگریزوں کی اوائل فتوحات کے زمانے میں ہیسٹنگس اور کلائیو وغیرہ نے ہندستانی سلطنتوں کو ایک دوسرے سے لڑایا اور اپنا مطلب نکالنے کیلئے کبھی اِن کا ساتھ دیا اور کبھی اُن کا وہی نقشہ ہندستان میں دوبارہ نظر آسکتا ہے۔

(۷) ہندستان کی آزادی ہمیشہ کے لئے مسدود ہو جاتی ہے۔

(۸) پاکستان اور بنگال جنھیں مسلمانوں کا وطن قرار دیا گیا ہے۔غیر مسلموں کی اتنی زبردست اور طاقتور اقلیت رہ جاتی ہے جسے سنبھالنا مشکل ہوگا۔ پاکستان میں ۴۰ فیصدی ہندو اور سکھ رہ جاتے ہیں اور بنگال میں ۴۲ فیصدی ہندو۔ ۴۰ یا ۴۲ فیصدی کی اقلیت درحقیقت اقلیت نہیں بلکہ اسے ایک مساوی قوم کہنا چاہئے۔ پھر یہ اقلیت دولت علم اور سیاست میں مسلمانوں سے بہت آگے ہے۔ اُن کی اتنی بڑی تعداد میں مسلم علاقوں میں موجودگی کی صورت میں اسلامی حکومت قائم کرنا ناممکن ہے۔

سِکندر اسکیم

یہ اسکیم مسلمانوں اور دیسی رئیسوں کو مطمئن کرنے کے نقطۂ نظر سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (۱۹۳۵ء) کی ترمیم کیلئے پیش کی گئی ہے۔ اِس اسکیم میں ہندستان کیلئے وفاق (FEDERATION) کو ناگزیر قرار دیا گیا ہے۔ اور اس میں ہندستان کو مندرجہ ذیل سات متجانس (HOMOGENEOUS) منطقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

منطقہ ۱

اِس میں آسام اور بنگال (ایک یا دو مغربی اضلاع کے ماسوا) کے صوبے اور بنگال کی ریاستیں اور سِکّم شامل ہوگا۔

منطقہ ۲

بہار اور اڑیسہ کے صوبے نیز بنگال کے دو اضلاع جو اڑیسہ میں شامل کئے جائیں گے۔

منطقہ ۳

صوبہ متحدہ اور اس کی تمام ریاستیں۔

منطقہ ۴

صوبۂ مدراس، مدراس کی ریاستیں اور ٹراونکور اور کورگ۔

منطقہ ۵

اس میں بمبئی، حیدرآباد، مغربی ہند کی ریاستیں، صوبہ بمبئی کی ریاستیں، میسور اور صوبہ متوسط کی دیسی ریاستیں شامل ہوں گی۔

منطقہ ۶

راجپوتانہ کی ریاستیں (بیکانیر اور جیسلمیر کے ماسوا) گوالیار، وسط ہند کی ریاستیں اور صوبۂ بہار واڑیسہ کی ریاستیں اور صوبۂ متوسط اور برار۔

منطقہ ۷

اس منطقے میں صوبۂ پنجاب، صوبۂ سرحد، سندھ، کشمیر، بلوچستان، صوبۂ پنجاب کی ریاستیں اور بیکانیر اور جیسلمیر کی ریاستیں ہوں گی۔

مرکز

یہ اسکیم گویا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی ترمیم ہے اس لئے اس میں اکثر وہی چیزیں ہیں جو اس ایکٹ میں موجود ہیں۔ ایک آل انڈیا فیڈریشن تسلیم کیا گیا ہے۔ ہر منطقے (ZONE) کے لئے ایک منطقی مجلس مقننہ (REGIONAL LEGISLATURE) رکھی گئی ہے جس میں اس زون کے برطانی حصوں اور ریاستی حصوں کے نمایندے ہوں گے۔ اس طرح مندرجہ بالا سات منطقوں کی نمایندگی کیلئے جو اراکین منتخب ہوں گے وہ فیڈرل لیجسلیٹو اسمبلی بنائیں گے۔ اور اس اسمبلی کی طاقت ۳۷۵ - اراکین (۲۵۰ برطانی ہند سے اور ۱۲۵ ریاستوں سے) کی ہوگی۔ اس تعداد میں ⅓ حصہ یعنی ۱۲۵ مسلمان ہوں گے۔ مسلمانوں کے علاوہ دوسری اقلیتوں کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو موجودہ دستور (۱۹۳۵ء) میں ہیں۔

فیڈرل منتظمہ (FEDERAL EXECUTIVE) ان اراکین پر مشتمل ہوگی۔ (۱) وائسرائے اور

(۲) وزراء کی ایک کانسل۔

وزراء کی تعداد کم ازکم سات اور زیادہ سے زیادہ گیارہ ہوگی، جنھیں فیڈرل اسمبلی کے ارکین میں سے چُنا جائے گا۔ وزیراعظم کے انتخاب کا حق وائسرائے کو ہوگا اور کابینہ کے بقیہ وزرا بھی وائسرائے ہی نامزد کریں گے، لیکن اس امر میں وزیراعظم سے مشورہ لے لیں گے۔ یہ لازمی ہوگا کہ ہر منطقے سے ایک وزیر لیا جائے، اور وزراء کی ⅓ تعداد مسلمان ہو۔ کم ازکم دو۔ اور اگر وزرار کی تعداد ۷ سے زیادہ ہوئی تو تین وزرار ریاستوں سے لئے جائیں گے۔ ابتدائی پندرہ ۱۵ یا بیس ۲۰ سال تک وائسرائے کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ دو ۲ وزرار فیڈرل اسمبلی سے باہر سے لیں، جن کے ذمے دفاع (DEFENCE) اور خارجی معاملات ہوں گے۔ اگر کوئی وزیر اپنے منطقے کا اعتماد کھودے گا تو اُسے وزارت سے استعفیٰ دیدینا پڑے گا۔ فیڈرل اسمبلی میں کابینہ کے خلاف عدم اعتماد کی تجویز پاس ہوجانے پر ساری کابینہ کو استعفیٰ دیدینا پڑے گا۔ لیکن دفاع اور خارجی معاملات کے وزراء جو اسمبلی سے باہر کے ہوں گے۔ ان کے خلاف عدم اعتماد کی کوئی تجویز نہ لائی جاسکے گی۔

فیڈرل اسمبلی کے ارکین کا انتخاب صوبے کی مجالس مقننہ کریں گی۔ لیکن ریاستوں کے نمایندوں کا انتخاب اس طرح ہوگا کہ ابتدائی دس برسوں تک ¾ ارکین دیسی رجواڑے نامزد کریں گے اور ¼ تعداد ریاستوں کی اسمبلی سے لئے جائیں گے۔

دستور میں اِن اُمور کا تحفظ کیا جائے گا (۱) انگریزوں کے خلاف نسلی امتیاز کا کوئی جذبہ نہ پیدا ہونے پائے۔ (۲) ریاستوں اور برطانیہ کے درمیان جو پرانے عہدنامے ہیں اُنھیں قائم رکھا جائے۔ یکم جنوری ۱۹۳۷ء کو انڈین آرمی کی جو شکل وصورت تھی اُسے علیٰ حالہ قائم رکھا جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔ خارجی تعلقات رسل ورسائل، کرنسی، چنگی، وغیرہ کے محکمے مرکز کے ہاتھ میں رہیں گے۔ بقیہ تمام معاملات صوبوں اور منطقوں کو تفویض کر دئے جائیں گے۔ مابقیہ (RESIDUARY) معاملات بھی صوبوں ہی کو حاصل رہیں گے۔

نقائص

اس اسکیم پر ہم اس لئے زیادہ توجہ دینا نہیں چاہتے کہ یہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی ایک دوسری شکل ہے۔ ہندستان اس دستور کو ناقابلِ قبول ٹھہرا چکا ہے اور خواہ اسے کسی شکل میں بھی پیش کیا جائے اسے منظور نہیں کرسکتا۔ ہاں، سر سکندر حیات نے اس اسکیم میں مسلمانوں کے جو حقوق رکھے ہیں ان پر البتہ

گفت و شنید ہو سکتی ہے اور اس کی بنا پر کوئی باہمی سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔ بہر حال اس اسکیم میں جو نقائص ہیں وہ مختصر الفاظ میں یہ ہیں:-

(۱) صوبائی اور مرکزی (فیڈرل) مجالس مقننہ کے درمیان ایک مزید مجلس مقننہ یعنی آل لیجسلیچر کے نام سے رکھ دی گئی ہے جس سے انتظامی امور اور قانون سازی میں چند در چند مشکلات پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

(۲) ریاستی نمایندوں کیلئے براہ راست انتخاب کے عوض نامزدگی رکھی گئی ہے اور ان کی ایک بڑی تعداد فڈرل اسمبلی میں (۲/۳) نامزد ہو کر آئے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ نامزد شدہ اراکین راجہ کے مفاد کی نگرانی کریں گے اور عوام سے ان کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔

(۳) وزیر اعظم کے انتخاب کا اختیار فڈرل اسمبلی کو نہیں دیا گیا ہے علاوہ ازیں بقیہ وزراء کے انتخاب بھی عملی طور پر والسرائے ہی کریں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ساری کابینہ والسرائے کی ہوگی۔ والسرائے ان کے ذریعہ جیسی حکومت چاہیں گے کر سکیں گے۔ فڈرل اسمبلی میں رجواڑوں کے نامزد کردہ اراکین اور پھر فرقہ وارانہ انتخاب پر منتخب شدہ اراکین کی ایک خاصی تعداد آجائیگی جسکے سبب کابینہ پر عدم اعتماد کی تجویز کا پاس ہونا مشکل ہو جائیگا۔

(۴) کابینہ میں دو ایسے وزرار کا شامل کیا جانا جو فڈرل اسمبلی کے ممبر نہ ہوں اور دفاع اور خارج معاملات جیسے اہم محکمے ان کے سپرد کر دینا یقینی ملکی مفاد کیلئے سخت مضرت رساں ہوگا۔ پھر یہ بھی ہے کہ ان وزراء پر عدم اعتماد کی تجویز نہیں لائی جا سکتی۔

(۵) اس اسکیم سے ہندستان کی پوزیشن موجودہ دستور سے آگے نہیں جاتی اور آزادی تو ایک خواب و خیال ہو جاتی ہے۔

لیکن بہر حال اس اسکیم میں ایک خوبی بھی ہے، اور وہ یہ کہ دوسری اسکیموں کی طرح اس میں ہندستان کو فرقہ وارانہ طور پر تقسیم نہیں کیا گیا ہے۔ اس اسکیم کو زیادہ سے زیادہ صوبوں کی ایک جدید تقسیم کہہ سکتے ہیں، جس میں اس امر کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ تمام منطقے ثقافتی اعتبار سے متجانس (HOMOGENOUS) ہوں۔

اسد اللہ اسکیم

یہ اسکیم بہت ہی سہل اور مختصر ہے یعنی شمالی ہندستان مسلمانوں کو دیدیا جائے اور مسیتو را

اور ونڈھیا پہاڑوں کے دکھن کا حصہ ہندوؤں کو۔ اسکیم میں بہت بڑے پیمانے پر تبادلۂ آبادی کا بھی مشورہ دیا گیا ہے اور شمالی ہندستان کے تمام ہندوؤں کو مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ جنوبی ہند میں چلے جائیں اور جنوبی ہند کے کل مسلمان شمالی ہند میں آ بسیں۔

یہ اسکیم اس قدر مہمل اور غیر منصفانہ ہے کہ اس پر کسی قسم کے تبصرے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

پنجابی کی اسکیم

اس اسکیم کے ذریعہ ہندستان کو مندرجۂ ذیل پانچ وفاقوں پر تقسیم کیا گیا ہے جو ایک "کل ہند اتحادیہ" ALL-INDIA FEDERATION میں شامل ہوں گے۔

۱۔ سندھستان فیڈریشن

اس فیڈریشن میں صوبۂ پنجاب (انبالہ ڈویژن کانگڑا اور ہوشیار پور ضلع کی گڈھ شنکر اور اناؤں تحصیلوں کے ماسوا)۔ صوبۂ سرحد، سندھ، بلوچستان، کے صوبے اور کشمیر، بھاولپور، امتب، دیر، سوات، چترال، خان پور، قلات، لاس بیلا، کپورتھلہ، اور مالیر کوٹلہ کی ریاستیں ہوں گی۔ یہ تمام ریاستیں اور صوبے سندھستان فیڈریشن کے اجزاء (UNITS) ہوں گے۔

رقبہ۔ ۳ لاکھ ۹۸ ہزار مربع میل۔ مجموعی آبادی ۳ کروڑ ۔ ۳ لاکھ۔ مسلمان ۸۳ فیصدی۔ ہندو ۸ فیصدی، سکھ ۶ فیصدی۔

۲۔ ہندستان فیڈریشن

اس میں صوبۂ متحدہ، صوبۂ متوسط، صوبۂ بہار، اڑیسہ، آسام، مدراس، بمبئی، صوبۂ بنگال کے مغربی اضلاع (یعنی بردوان ڈویژن) اور ہندستان کی تمام ریاستیں (راجستھان اور دکن فیڈریشن کی ریاستوں کے علاوہ) شامل ہوں گی۔

رقبہ۔ ۷ لاکھ ۴۱ ہزار مربع میل۔ مجموعی آبادی ۲۱ کروڑ ۶ لاکھ، ہندو ۸۲ فیصدی۔ مسلمان ۱۱ فیصدی۔

۳۔ راجستھان فیڈریشن

اس میں راجپوتانہ اور سنٹرل انڈیا کی تمام ریاستیں شامل ہوں گی۔

رقبہ۔ ۱ لاکھ ۸۰ ہزار مربع میل۔ مجموعی آبادی ۱ کرور ۸۰ لاکھ۔ ہندو ۸۶ فیصدی۔ مسلمان ۸ فیصدی۔

۴۔ دکنی ریاستوں کا فیڈریشن

اس فیڈریشن میں ریاست حیدرآباد، میسور، اور باستور کی ریاستیں ہوں گی۔

رقبہ۔ ۱ لاکھ ۲۵ ہزار مربع میل۔ مجموعی آبادی ۳ کرور ۱۵ لاکھ۔ ہندو ۸۵ فیصدی۔ مسلمان ۸ فی صدی۔

۵۔ بنگال فیڈریشن

اس فیڈریشن میں مشرقی بنگال کے وہ اضلاع ہوں گے جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے (یعنی دیناج پور، مالدہ، رنگ پور، بوگرا، راج شاہی، مرشد آباد، پبنہ، میمن سنگھ، ندیا، جیسور، فرید پور، ڈھاکہ، ٹپرا، نوا کھالی، باقر گنج، کھلنا، اور چاٹگام کے اضلاع) علاوہ اس کے اس فیڈریشن میں صوبہ آسام کے گوالپارہ اور سلہٹ کے اضلاع اور بنگال کی وہ ریاستیں جو اس حلقے میں ہیں، شامل ہوں گی۔

رقبہ۔ ۵۹ ہزار مربع میل۔ مجموعی آبادی ۳ کرور۔ ۱ لاکھ۔ مسلمان ۲ کرور ۵ لاکھ (۶۶ فیصدی) ہندو ۱ کرور ۱ لاکھ (۳۳ فیصدی)

مرکز

حالانکہ پنجابی صاحب نے اپنی اسکیم کی وضاحت پر ۲۷۳ صفحے سیاہ کر دئے ہیں لیکن مرکزی حکومت کی مشینری کیسی ہو گی اور وہ کس طرح چلے گی اس کے متعلق بہت کم لکھا ہے اس سلسلہ میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ ذیل کا پیراگراف ہے۔

"مندرجہ بالا طریقہ پر ہندستان کی ایک احدیہ CONFEDERACY بنانے کے بعد ہر فیڈریشن جو اس میں شامل ہو گا اس کے اندر ایک گورنر جنرل اور اس کی صوبائی وحدتوں (UNITS) کے گورنر ہوں گے، جو کانفڈریسی کے آگے صیغہ جاتِ احدیہ، ریاستوں کے معاملات اور

تاج کی ذمہ داریوں کیلئے جوابدہ ہوں گے۔ کانفڈرل حاکم وائسرائے اور اُن کی ایک کانفڈرل اسمبلی ہوگی، جس کے اراکین ہندستان کے مختلف وفاقوں سے لئے جائیں گے۔ ہر فیڈریشن سے کانفڈریسی میں آنے والے اراکین کی تعداد کا تقرر اس فیڈریشن کے رقبۂ آبادی اور اقتصادی حالات وغیرہ کو مدنظر رکھ کر کیا جائے گا۔ خارجی تعلقات دفاع، مشترک قدرتی ذرائع سے آبپاشی کا صیغہ اور فیڈریشن میں شامل ہونے والی ریاستوں کے متعلق وہ ذمہ داریاں جو تاج پر عائد ہوتی ہیں، متعلقہ فیڈریشن کے گورنر جنرل کے سپرد کی جائیں گی۔ جو بالآخر وائسرائے کے آگے جوابدہ ہوگا۔ کانفڈریسی میں جو فیڈریشن شامل ہوں گے وہ یا تو براہ راست اسے ایک مقررہ خراج دینا منظور کریں گے یا اپنی آمدنی کے چند مدات اس کے لئے مخصوص کردیں گے، جن سے ایک مقررہ رقم کانفڈریسی کو ادا کی جایا کرے گی۔

"ہم یہاں یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ شمالی و مغربی فیڈریشن کسی حالت میں بھی اپنی چنگی کی آمدنی کو کانفڈریسی کیلئے وقف نہ کرے گا۔"

(کانفڈریسی آف انڈیا صفحہ ۱۲)

تبادلۂ آبادی کو مصنفِ اسکیم نے ناپسند کیا ہے اور اسے نقصان دہ بتلایا ہے۔

یہ ہے "پنجابی کی اسکیم" جو "کانفڈریسی آف انڈیا" نامی تصنیف میں درج ہے۔ ہم نے تمام اسکیموں کو صحافتی دیانتداری کے ساتھ صحیح طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور ان میں جو نقائص ہیں اُنھیں بھی اختصار کے ساتھ بیان کردیا ہے۔ لیکن پنجابی کی اسکیم چونکہ میرے خیال میں مسلم لیگ کی سرکاری اسکیم ہے، اس لئے اس پر اگلے صفحات میں مفصّل طور پر بحث کروں گا، اور اس کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔

پاکستان
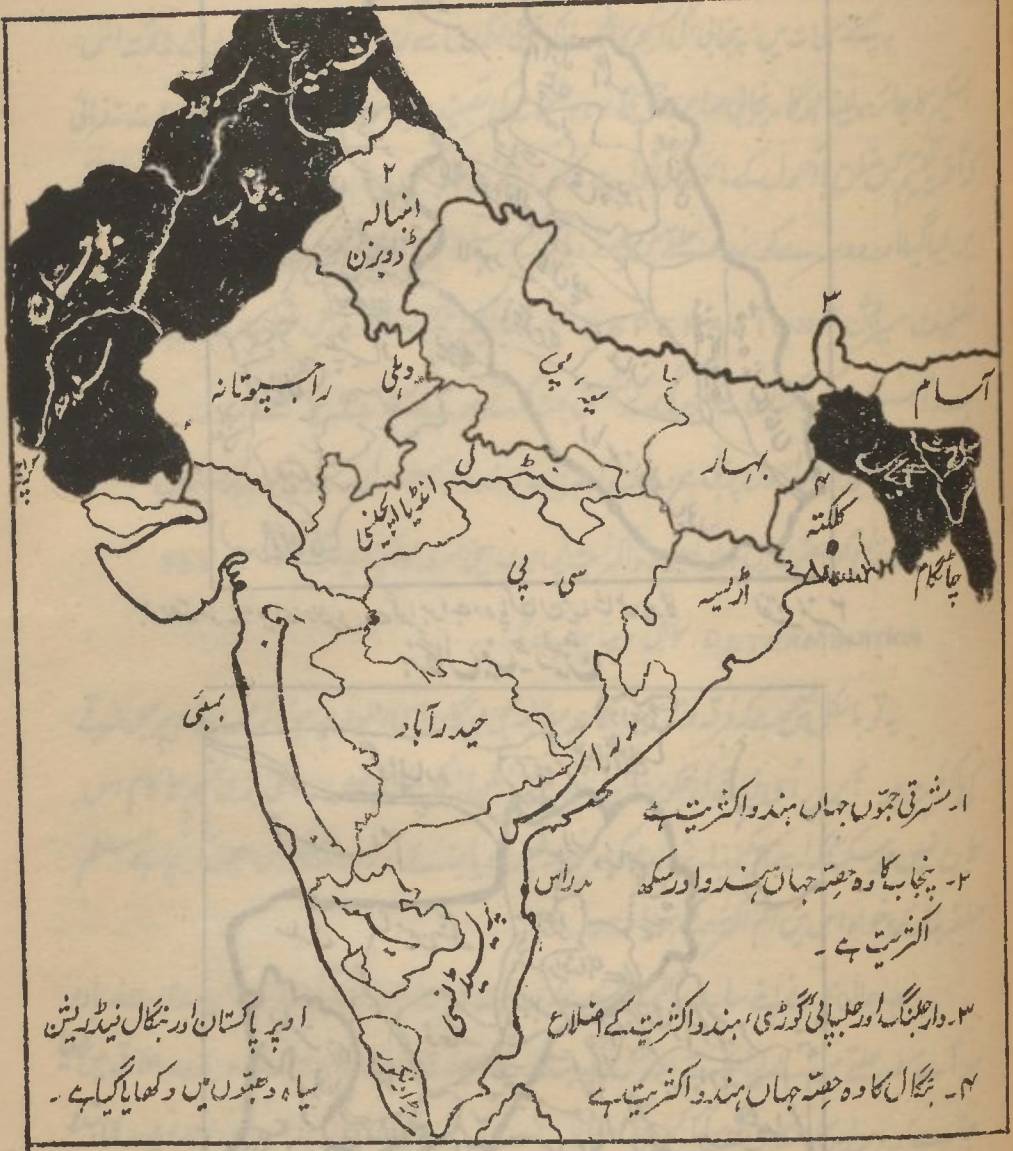
نقشہ نمبر ۱

پنجاب

جو حصہ موٹے سیاہ خطوں سے گھرا ہوا ہے وہ پاکستان میں شامل ہوگا — نقشہ نمبر ۲

بنگال فیڈریشن

موٹے سیاہ خطوں کے اندر کا حصہ بنگال مسلم فیڈریشن ہے۔ — نقشہ نمبر ۳

تقسیم کا اصول کیا ہو؟

پچھلے صفحات میں "پنجابی" کی اسکیم کا ایک خاکہ آپکی نظروں سے گذرا۔ اب ہمیں کسی اصول کے ماتحت اس اسکیم کا جائزہ لینا ہوگا۔ پنجابی صاحب نے اپنی ۲۰۲ صفحات کی تصنیف میں کہیں پر یہ بات بتانے کی زحمت نہ فرمائی کہ آخر یہ تقسیم کس منطق یا اصول کے ماتحت کی گئی ہے، اور وہ کون سا کلیہ ہے جس کی بنا پر کسی ایک ضلع کو مسلم حلقے میں لیا گیا اور دوسرے کو ہندو حلقے میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں پنجابی صاحب کی ایک دوسری انگریزی تصنیف سپریشن "SEPERATION" میں ایک ہلکا سا اشارہ ہمیں ملتا ہے۔ مشرقی پنجاب کے ہندو اضلاع کی پاکستان سے علیحدگی کے متعلق بحث کرتے ہوئے صفحہ ۱۸ پر لکھتے ہیں:۔

"یہ علیحدگی جس اصول پر مبنی ہے وہ یہ ہے کہ ہر ایک (ہندو اور مسلمان) قومیتوں کو ہندستان کے تمام اُن حصّوں میں جہاں کہیں وہ اکثریت میں ہوں اپنی قسمت کا آپ فیصلہ کرنے SELF DETERMINATION کا حق دینا چاہیئے"۔

یہ تو بالکل صحیح ہے کہ فرقہ وار تقسیم کا جو مطالبہ بھی ہوگا وہ اسی اصول پر ہوگا کہ جس مقام پر جس فرقے کی اکثریت ہو اُس پر اُسی فرقے کی حکومت ہونی چاہیے۔ لیکن اتنا کہنا کافی نہیں۔ اتنی بڑی تقسیم کا کام اس طرح نہیں ہو سکتا کہ اسے اسکیم بنانے والے کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے اور وہ ملک کے جس حصّہ کو چاہے مسلم حلقہ بنائے، خواہ اس میں مسلم اکثریت ہو یا نہ ہو۔

بہرحال ہم نے اپنے سامنے یہ کلیہ رکھا ہے کہ جن مقامات پر مسلمانوں کی آبادی ۵۰ فیصدی سے زیادہ ہو اُسے مسلم حلقے میں لے لیا جائے اور جس جگہ ہندو ۵۰ فیصدی سے زیادہ ہوں وہ ہندو علاقے میں ملا دیا جائے۔ اس امر کا امکان نہیں کہ کسی جگہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی آبادی برابر ہو۔ یعنی ۵۰ فیصدی ہندو اور ۵۰ فیصدی مسلمان۔ اب اس کسوٹی پر ہمیں اس تقسیم کا جائزہ لینا ہے۔

ہندستان اور صوبوں کی آبادیاں

اس تقسیم کو سمجھنے کیلئے تمام صوبوں کے اعداد و شمار سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے ہم یہاں ہندستان کا رقبہ، آبادی اور مسلم اکثریت کے صوبوں کی آبادی درج کر دیتے ہیں تاکہ مقابلے میں آسانی ہو۔

سارے ہندستان کا رقبہ ۱۸ لاکھ مربع میل ہے اور آبادی ۳۵ کروڑ پانچ لاکھ ہے۔ لیکن ۱۹۳۶ء میں ہندستان سے برما کے علیحدہ ہو جانے کے بعد اس کا رقبہ ۱۵ لاکھ ۶۷ ہزار مربع میل اور آبادی ۳۴ کروڑ ۲۰ لاکھ رہ گئی۔

مسلم اکثریت کے صوبے (برطانی علاقہ۔ مطابق مردم شماری ۱۹۳۱ء)

	نام صوبہ	مسلمان	فی صدی	ہندو	فی صدی	سکھ	فی صدی
۱	پنجاب	۱ کرور ۳۳ لاکھ	۵۶	۶۳ لاکھ	۲۷	۳۱ لاکھ	۱۳
۲	بنگال	۲ کرور ۴۷ لاکھ	۵۴	۲ کرور ۱۵ لاکھ	۴۳	×	
۳	صوبۂ سرحد	۲۲ لاکھ ۲۷ ہزار	۹۱	۱ لاکھ ۴۲ ہزار	۵	۴۲ ہزار	۲
۴	سندھ	۲۸ لاکھ ۳۰ ہزار	۷۵	۱۰ لاکھ ۱۵ ہزار	۲۵	×	
۵	بلوچستان	۴ لاکھ ۵ ہزار	۹۰	۴۱ ہزار	۸	۸ ہزار	۱
		۴ کرور ۶۱ لاکھ		۲ کرور ۸۹ لاکھ		۳۱ لاکھ	

پنجاب

صوبۂ سرحد، سندھ، بلوچستان کے صوبوں میں مسلمانوں کی کھلم کھلا اکثریت ہے اور ان صوبوں میں مسلمان کسی جگہ ۷۵ فیصدی سے کم نہیں، اس لئے کلیہ کے مطابق یہ صوبے بے روک ٹوک مسلم حلقے میں جا سکتے ہیں۔ لیکن پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اتنی قلیل اکثریت ہے کہ ان صوبوں کے ہر حصے کا ہمیں بالتفصیل جائزہ لینا ہوگا۔ اور اس کلئے کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھنا ہوگا کہ کون سا حصۂ مسلم حلقے میں جا سکتا ہے اور کون سا نہیں۔ پہلے پنجاب کو لیجئے۔

پنجاب میں کل ۲۹ اضلاع ہیں۔ جنمیں ۱۷ اضلاع تو ایسے ہیں کہ ان میں مسلمان ۵۱ فی صدی سے زیادہ ہیں لیکن مشرقی پنجاب کے بارہ ضلعے ایسے ہیں جن میں مسلمان ۵۰ فیصدی سے کم ہیں تو وہ اضلاع اور ان کی آبادیاں یہ ہیں۔

پنجاب کے مسلم اقلیت کے ضلعے

	نام ضلع	مسلم آبادی ایک ہزار میں
۱	حسار	۲۸۲
۲	رہتک	۱۷۱
۳	گوڑگاؤں	۳۲۷
۴	کرنال	۳۰۵
۵	انبالہ	۳۱۱
۶	شملہ	۱۵۸
۷	کانگڑا	۵۰
۸	ہوشیارپور	۳۱۸
۹	جالندھر	۴۴۵
۱۰	لودھیانہ	۳۵۰
۱۱	فیروزپور	۴۴۶
۱۲	امرتسر	۴۹۰

ان میں انبالہ، حسار، رہتک، گوڑگاؤں، کرنال اور شملہ چھ ضلعے انبالہ ڈویزن میں ہیں، اور کانگڑا، ہوشیارپور، جالندھر، لودھیانہ اور فیروزپور کے پانچ اضلاع جالندھر ڈویزن میں ہیں صرف امرتسر لاہور ڈویزن میں ہے۔

مندرجۂ بالا اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اضلاع میں مسلمانوں کی اقلیت ہے، اور وہ کسی ضلع میں بھی ۵۱ فی صدی نہیں ہیں۔

ان اضلاع کے علاوہ ایک ضلع گورداسپور کا ہے، جس میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب

پچاس فیصدی سے اُوپر ہے۔ لیکن مندرجہ بالا کلیئے کے مطابق اسے بھی ہم مسلم حلقے میں شامل کر لیتے ہیں۔

سارے پنجاب کا رقبہ ۷۷ ہزار مربع میل ہے جس میں ۲ کروڑ ۳۶ لاکھ نفوس آباد ہیں۔ ان میں ایک کروڑ ۳۳ لاکھ مسلمان ہیں ۶۳ لاکھ ہندو اور ۳۱ لاکھ سکھ ہیں یعنی کل آبادی میں مسلمان ۵۶ فیصدی ہندو، ۲۷ فی صدی اور سکھ ۱۳ فیصدی ہیں۔ مندرجہ بالا بارہ ضلعوں کی آبادی، جن میں مسلمان اقلیت میں ہیں ۹۸ لاکھ ہے۔ جن میں ۴۴ لاکھ ہندو، ۱۸ لاکھ سکھ اور ۲۹ لاکھ مسلمان ہیں۔ یعنی اگر ہندو اور سکھوں کو ملا کر دیکھیں تو ۲۹ لاکھ کی مسلم آبادی کے مقابلے میں ان کی ۶۲ لاکھ کی آبادی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ ان بارہ ضلعوں کو کسی طرح پاکستان میں شامل نہیں کر سکتے۔ مسلمانوں کے ہاتھ میں پورا پنجاب کا صوبہ نہیں آسکتا۔ ہندو پنجاب اور مسلم پنجاب علیحٰدہ علیحٰدہ کرنا ہوگا اور پھر ۱۲ ضلعوں کا ایک عظیم الشان خطہ، جو سارے پنجاب کے نصف کے برابر ہے۔ پاکستان سے نکال کر ہندو فیڈریشن میں شامل کر دینا ہوگا۔ پنجاب دو ٹکڑے ہو جائیگا۔ اور مسلمانوں کے ہاتھ آدھا پنجاب ہی آئے گا۔ سر سکندر حیات جو آج ۲۹ ضلعے اور ۲ کروڑ ۳۶ لاکھ نفوس پر حکومت کر رہے ہیں۔ پاکستان ہو جانے کے بعد انھیں صرف ۱۷ ضلعوں اور کل ایک کروڑ ۳۰ لاکھ نفوس پر حکومت کرنے کی قناعت حاصل ہوگی۔

پنجابی صاحب نے اپنی اسکیم سے انبالہ ڈویژن کو تو خارج کر دیا ہے، لیکن تعجب ہے کہ اُنھوں نے جالندھر ڈویژن اور امرتسر کے ضلع کو کیوں نہیں خارج کیا۔ اس میں سے انھوں نے صرف کانگڑا ضلع اور ہوشیارپور ضلع کی گڈھ شنکر اور اُنا کی تحصیلوں کو خارج کیا ہے۔ لیکن ہوشیارپور جالندھر، لودھیانہ، فیروزپور اور امرتسر یہ پانچ اضلاع کس اصول کی بنا پر پاکستان میں شامل رکھے گئے ہیں سمجھ میں نہیں آتا۔

بنگال

تقریباً یہی کیفیت بنگال کی بھی ہے۔ بنگال کے بردوان ڈویژن اور پریسیڈنسی ڈویژن میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ ان دونوں کمشنریوں میں چھ چھ ضلعے ہیں اور وہ یہ ہیں۔

بردوان ڈویژن

(۱) بردوان (۲) بیر بھوم (۳) بانکوڑا (۴) مدناپور (۵) ہگلی اور (۶) ہاوڑا۔

پریسیڈنسی ڈویژن

(۷) ۲۴ پرگنہ (۸) کلکتہ (۹) ندیا (۱۰) مرشد آباد (۱۱) جیسور اور (۱۲) کھلنا۔

ان بارہ ضلعوں میں ۶۰ لاکھ مسلمان ——————— اور ایک کروڑ ۲۳ لاکھ ہندو ہیں۔ گرچہ سارے بنگال میں مسلمان ۵۵ فیصدی اور ہندو ۴۳ فیصدی ہیں لیکن ان اضلاع میں ہندو، مسلمانوں سے قریب قریب دونا ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ اضلاع بنگال مسلم فیڈریشن میں شامل نہیں کئے جا سکتے اور یہ ہندو ہندستان کے جزو بن جائیں گے۔

سارے بنگال کی مجموعی آبادی ۵ کروڑ ایک لاکھ ہے، اور اس کا رقبہ ۸۲ ہزار مربع میل ہے۔ ان بارہ ضلعوں کا مجموعی رقبہ ۳۲ ہزار مربع میل سے کچھ زیادہ ہے اور آبادی ایک کروڑ ۸۷ لاکھ ہے۔ یعنی اگر اس آبادی اور رقبے کو ہم بنگال سے نکال لیں تو مسلم بنگال میں صرف ۱۶ ضلعے رہ جائیں گے (بنگال میں کل ۲۸ اضلاع ہیں) اور اس کا مجموعی رقبہ ۵۱ ہزار مربع میل اور آبادی ۳ کروڑ ۱۴ لاکھ رہ جائے گی۔

چاٹگام ہلس کے ضلع میں حالانکہ مسلم اکثریت (۵۱ فی صدی) نہیں لیکن چونکہ اس کے ارد گرد مسلم اکثریت ہے اس لئے اسے وہاں سے نکالا نہیں جا سکتا اور اسے ہندستان میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اسے بنگال، فیڈریشن ہی میں رہنے دینا چاہئے بہرحال بنگال بھی دو ٹکڑے ہو جائیگا اور آج فضل الحق صاحب کی جو ۲۸ اضلاع پر حکومت ہے وہ صرف ۱۶ اضلاع پر رہ جائے گی۔ ایک کروڑ ۲۳ لاکھ ہندو ان کی حکومت سے نکل جائیں گے اور ان کے ساتھ ۶۰ لاکھ مسلمان بھی ہندو فیڈریشن میں چلے جائیں گے۔

الغرض مسلمانوں کے ہاتھ نصف پنجاب اور نصف بنگال ہی آئیگا۔ اور لطف تو یہ ہے کہ جو حصے پاکستان اور بنگال فیڈریشن سے نکلیں گے وہی سارے صوبے کی جان ہیں، پنجاب کی اکثر پیداوار انبالہ اور جالندھر ڈویژن میں ہے۔ اسی طرح مغربی بنگال نہ صرف بنگال بلکہ سارے ہندستان کی جان ہے۔ تمام عمدہ پیداوار، کل کارخانے، اور سب سے بڑھ کر کلکتہ ایسا عظیم الشان شہر، جس کا ساری برطانی شہنشاہیت میں دوسرا نمبر ہے بنگال مسلم فیڈریشن سے نکل جائیگا۔

بنگال فیڈریشن میں آسام کے کچھ حصّے بھی لئے گئے ہیں یعنی سلہٹ اور گوالپارہ۔ آسام کے کسی ضلع میں، سوائے سلہٹ کے، مسلمانوں کی آبادی ۵۰ فیصدی نہیں پائی جاتی۔ سلہٹ میں مسلمان ۶۰ فیصدی ہیں، اس لئے سلہٹ کو بلاشبہ بنگال فیڈریشن میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن گوالپارہ میں تو مسلمانوں کی آبادی صرف ۴۳ فیصدی ہے۔ گوالپارہ میں ۳ لاکھ ۸۰ ہزار مسلمان اور ۳ لاکھ ۵۸ ہزار ہندو ہیں یعنی ہندو اور مسلمان تقریباً برابر برابر ہیں لیکن گوالپارہ کی مجموعی آبادی ۸ لاکھ ۸۲ ہزار ہے اور تقریباً ایک لاکھ ۱۰ ہزار دوسری قومیں ہیں جو ہندوؤں ہی میں شمار ہوتی ہیں۔ گوالپارہ میں مسلمانوں کا تناسب ۹ر۴۳ فی صدی ہے اور ہندوؤں کا ۴ر۴۳ ہے۔ لہٰذا چونکہ گوالپارہ میں مسلم اکثریت (۵۱ فیصدی) نہیں اور ہندوؤں اور دوسری قوموں کو ملا کر ۵۷ فی صدی کی اکثریت بن جاتی ہے اس لئے یہ ضلع کسی طرح مسلم فیڈریشن میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

اس طرح بنگال فیڈریشن صرف ۱۷ اضلاع کا بنے گا، جو صوبۂ بہار سے (بہار میں ۱۶ اضلاع ہیں) کچھ بڑا اور یو۔ پی (یو۔ پی میں ۴۸ اضلاع ہیں) کا ایک تہائی ہوگا۔ لیکن ہمارے پاکستانی بھائیوں کی فرقہ وارانہ پیاس اسی سے بجھ جاتی ہے تو کیا کرنا ہے۔

پوربی بنگال میں ایک ریاست تری پورہ ہے، جس میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ اسے بنگال فیڈریشن میں شامل رکھا گیا ہے۔ ہمارے کلئے کے مطابق تو یہ شمول کسی طرح مناسب نہیں، لیکن چونکہ یہ ریاست چاروں طرف سے مسلم اکثریتوں سے گھری ہوئی ہے اور اسے وہاں سے علیٰحدہ کرنا مشکل ہے اس لئے اسے مسلم فیڈریشن ہی میں شامل رہنے دینا چاہیئے۔ اسکے برعکس ایک دوسری شمال پنجاب کی ریاست کپورتھلہ کی ہے، جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ لیکن وہ ہر چہار طرف سے ہندو اکثریت سے گھری ہوئی ہے۔ لہٰذا مندرجہ بالا معذوری کے سبب اسے ہندو اضلاع کے ساتھ ہندو فیڈریشن میں چھوڑ دینا ہوگا۔ بہر حال — عوض معاوضہ گلہ ندارد۔

ریاستیں

اب آیئے اس فارمولے (۵۱ فی صدی کی اکثریت) کو ریاستوں پر منطبق کر کے دیکھیں۔ پاکستان یا بنگال کے مسلم فیڈریشن میں یقینی وہی ریاستیں شامل کی جا سکتی ہیں جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہو۔ اس کسوٹی پر ہندستان میں صرف

چھ ریاستیں ہیں جو پوری اُترتی ہیں اور وہ یہ ہیں۔

مسلم اکثریت کی ریاستیں

	نام ریاست	رقبہ	مسلمان	ہندو
۱	کشمیر و جموں	۸۵ ہزار مربع میل	۲۸ لاکھ ۱۷ ہزار	۷ لاکھ ۳۷ ہزار
۲	بہاول پور	۱۵ " "	۸ لاکھ	۱ " ۴۵ "
۳	قلات	۷۳ " "	۳ " ۳۱ "	۱۱ "
۴	لاس بیلا	۷ " "	۶۲ ہزار	۷ ہزار
۵	خیرپور	۶ " "	۱ لاکھ ۸۷ ہزار	۴۰ ہزار
۶	کپورتھلہ	۵ سو "	۱ " ۷۹ "	
		۱ لاکھ ۹۰ ہزار مربع میل	۴۳ لاکھ ۵۷ ہزار	۹ لاکھ ۸۸ ہزار

ان چھ بڑی ریاستوں کے علاوہ صوبہ سرحد کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں مثلاً امب، چترال، دیر، اور سوات بھی ہیں۔ جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ لیکن امب کی ریاست دریائے سندھ کے مغربی ساحل پر صرف ایک گاؤں ہے۔ چترال کا رقبہ ۴۵۰۰ مربع میل ہے اور دیر کا ۵ ہزار مربع میل۔ لیکن چونکہ یہ تمام پہاڑی علاقے ہیں اس لئے یہ ریاستیں بہت قلیل آمدنی رکھتی ہیں اور ان کا شمار محض معمولی ریاستوں میں ہے۔

بہر حال ان پانچ یا چھ بڑی بڑی ریاستوں کے ماسوا ہندستان کی تمام ریاستوں میں غیر مسلموں کی اکثریت ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندستان کی ۶۰۰ ریاستوں میں مسلمانوں کے حصے میں صرف یہ چند ریاستیں آئیں گی، اور حیدرآباد، بھوپال، رام پور، ٹونک، جاورا، جوناگڑھ وغیرہ کی مسلم ریاستیں تمام کی تمام ہندو فیڈریشن میں چلی جائیں گی، اس کے یہ معنی نہیں کہ ان ریاستوں میں مسلمانوں کی حکومت نہ رہے گی۔ جس طرح کشمیر میں مہاراجہ کشمیر کی حکومت ہو گی اسی طرح مسلمان بھی حکمران رہینگے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ تمام مسلم ریاستیں ہندو فیڈریشن کا جزو ہو جائیں گی۔

ہندستان کی کل دیسی ریاستوں کا رقبہ ۷ لاکھ مربع میل ہے اگر ہم اس رقبے میں سے مندرجۂ بالا چھ مسلم ریاستوں کے رقبے ایک لاکھ ۸۹ ہزار مربع کو وضع کریں تو ہندو اکثریت والی ریاستوں کا رقبہ ۵ لاکھ ۱۱ ہزار مربع میل رہ جاتا ہے۔ یعنی پاکستان میں ہندستانی ریاستوں کا تقریباً ¼ حصہ آجاتا ہے۔ اس قدر غنیمت ہے لیکن اب ذرا آبادیوں کو ملاحظہ فرمائیے۔ ہندستان کی کل دیسی ریاستوں کی آبادی ۷ کروڑ ۹۱ لاکھ ہے جس میں ۶ کرور ۸۵ لاکھ ہندو اور ایک کرور چھ لاکھ مسلمان ہیں۔

اب اسے یوں سمجھئے کہ کُل ریاستی ہندوؤں میں سے کل ۹ لاکھ ہندو پاکستان میں آئیں گے اور بقیہ ۶ کرور ۶ لاکھ ہندو اپنے ہندو فیڈریشن میں رہیں گے۔ لیکن برخلاف اُس کے کُل ریاستی مسلمانوں میں سے صرف ۴۳ لاکھ مسلمان، پاکستان میں رہیں گے اور بقیہ ۶۳ لاکھ ہندو فیڈریشن میں یعنی جملہ ریاستی ہندوؤں میں سے زیادہ سے زیادہ ۵ فیصدی ہندو، پاکستان میں آئیں گے اور بقیہ ۹۵ فی صدی ہندو اپنے ہندو فیڈریشن میں جائیں گے۔ لیکن اس کے برعکس تقریباً ۳۵ فی صدی ریاستی مسلمان تو پاکستان میں رہیں گے اور ۶۵ فی صدی ریاستی مسلمان ہندو فیڈریشن میں۔

غرضیکہ جہاں تک ریاستی مسلمانوں کا معاملہ ہے پاکستان سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ ۶۵ فی صدی ریاستی مسلمان (یعنی ۶۳ لاکھ مسلمان) پاکستان سے باہر رہ جائیں گے یعنی (بقول فرقہ پروروں کے) ۶۳ لاکھ مسلمانوں پر ظالم ہندو اکثریت کی چکی چلتی رہے گی۔ لیکن ۶ کرور ۶ لاکھ ہندو صرف ہندو فیڈریشن میں رہیں گے۔ اور ان کے لئے ترقی کے تمام دروازے کھلے ہوں گے۔

میں نے اوپر کے چارٹ میں جموّں کو کشمیر کی ریاست میں شامل رکھا ہے۔ لیکن جموّں کے صوبے میں مسلمانوں کی اکثریت نہیں بلکہ ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ ریاست کشمیر کے مغربی حصے میں یعنی پونچھ، ریاسی، اور میرپور، وغیرہ کے علاقے میں مسلم اکثریت ہے لیکن ادھم پور، بھدرواہ، کٹھوا، چنینی، اور جموّں (خاص) کے علاقے میں ہندو اکثریت ہے۔ ریاست کشمیر کے یہ دونوں ٹکڑے جغرافیائی حیثیت سے بھی بہت زیادہ مختلف ہیں۔ ریاست کشمیر اور جموّں کا مجموعی رقبہ ۷۵ ہزار مربع میل ہے۔ اور مشرقی جموّں کا رقبہ ۷ ہزار مربع میل ہے۔ کشمیر و جموّں کی ریاست میں مسلمانوں کی آبادی

۲۸ لاکھ ۷۱ہزار ہے اور ہندوؤں کی، ۷ لاکھ ۳۶ ہزار۔ صوبۂ کشمیر میں ۹۵ فی صدی مسلمان ہیں، لیکن پوربی جموّں کے صوبے میں ۶۵ فی صدی ہندو اور ۳۵ فی صدی مسلمان ہیں لہٰذا فرقہ وار اکثریت کے اصول کے تحت یقینی اِس علاقے کو پاکستان میں شامل کرنے پر ہندوؤں کو اعتراض ہوگا اور کوئی وجہ نہیں کہ پوربی جموّں کے اودھم پور، بھدورا، کیھتوا، چینی اور جموّں خاص کو کیوں نہ پاکستان سے علیحدہ کر لیا جائے اور اس کے پڑوس کے جالندھر ڈویزن کے ساتھ ساتھ اسے ہندو فیڈریشن میں شامل کر دیا جائے۔

پنجاب اور بنگال کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے۔ لیجئے کشمیر کے بھی دو ٹکڑے ہو گئے۔ مندرجۂ بالا چارٹ میں میں نے کپورتھلہ کی ریاست کو بھی مسلم ریاستوں میں شامل رکھا ہے۔ لیکن یہ ریاست مسلم اکثریت رکھتے ہوئے بھی پاکستان میں نہیں جا سکتی۔ کیونکہ اس کے ارد گرد چاروں طرف ہندو اکثریت ہے اور ان ہندو اضلاع کے ساتھ اِسے بھی ہندو فیڈریشن میں جانا پڑے گا۔ جس طرح بنگال میں تری پورہ کی ریاست ہندو اکثریت رکھنے کے باوجود اسی مجبوری کے سبب مسلم فیڈریشن میں چلی جائے گی۔ غرضیکہ کپورتھلہ کی علیٰحدگی سے مزید ایک لاکھ ۹ ہزار مسلمان ہندو فیڈریشن میں چلے جائیں گے۔

تحریکِ پاکستان نے جموّں اور کپورتھلہ کے مسئلہ پر غور نہیں کیا ہے اور ان دونوں ریاستوں کو پاکستان میں شامل رکھا ہے۔ اِسی طرح مالیرکوٹلہ کی ریاست کو بھی انھوں نے پاکستان میں شامل رکھا ہے۔ حالانکہ اس میں غیر مسلموں کی اکثریت ہے (مسلمان ۳۱ ہزار۔ ہندو ۱۲ ہزار اور سکھ ۲۰ ہزار)، لیکن اس طرح تو کام نہ چلے گا۔ جب فرقہ وار اکثریت کا سوال اٹھایا ہے تو ہر قدم پر اس اصول کی پابندی کرنی پڑے گی۔ آدھا بنگال، آدھا پنجاب، اور آدھا کشمیر چھوڑ دینا پڑے گا۔ جب ہندو اکثریت کی حکومت میں مسلمانوں کا کلچر، تمدن اور مذہب کو خطرہ ہے تو ظاہر ہے کہ مسلم اکثریت کی حکومت میں ہندوؤں کے مذہب اور کلچر کو بھی خطرہ محسوس ہوگا۔

پاکستان کی وسعت

مختصر یہ ہے کہ مسلم لیگ کے فرقہ وارانہ اکثریت کے اصول کے ماتحت پاکستان کی اِسی قدر وسعت ممکن ہے جو اوپر بیان کی گئی۔ اگر کوئی شخص "پاکستان" میں اس سے زیادہ اضافہ کرنا چاہتا ہے تو اس کے ہاتھ میں قلم ہے کر لے۔

لیکن جب گفتگو فرقہ وارجذبہ اور جبوں کے عوض کسی اصول اور معقولیت کی بنا پر ہوگی تو پاکستان کی، اس سے زیادہ وسعت ناممکن ہے۔ اِس سلسلے میں ہم نے تین نقشے (نقشہ نمبر ۱-۲، و ۳) قارئین کے ملاحظہ کیلئے دیے ہیں۔ اول نقشہ میں سارے ہندستان کے اندر پاکستان کی وسعتوں کو دکھلایا گیا ہے، اور نمبر ۲ و ۳ میں پنجاب اور بنگال و آسام کے صوبوں میں پاکستان اور مسلم فیڈریشن کا پھیلاؤ بتلایا گیا ہے۔

بہرحال پاکستان کو آل انڈیا نقطہ نظر سے دیکھنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پچھم میں بلوچستان، سندھ، اور سرحد کے صوبے اور پنجاب کے ۱۷ اضلاع پاکستان میں شامل ہوں گے۔ پورب میں بنگال کے ۲۳ اضلاع اور آسام کا ایک ضلع سلہٹ بنگال فیڈریشن میں شامل ہوگا۔ علاوہ ازیں مسلم اکثریت کی پانچ ریاستیں یعنی بھاولپور، لاس بیلا، قلات، خیرپور، اور کشمیر (جموں کے سوا) پاکستان میں شامل ہوں گی۔ جموں کو یقینی چھوڑنا پڑے گا اور اگر کپورتھلہ کو مسلم فیڈریشن میں شامل رکھا گیا تو پھر تری پورا کی ریاست کو جو بنگال میں ہے بنگال مسلم فیڈریشن سے علیحدہ کر دینا ہوگا۔

اِس طرح پاکستان اور بنگال مسلم فیڈریشن میں کل برطانی ہند کا ایک لاکھ ۵۷ ہزار مربع میل کا رقبہ اور ۵ کروڑ ۱۴ لاکھ کی مجموعی آبادی ہوگی، جس میں ۳ کروڑ ۵۳ لاکھ مسلمان، ایک کروڑ ۲۶ لاکھ ہندو اور ۱۵ لاکھ سکھ ہوں گے۔ اگر ان اعداد و شمار میں متذکرہ چھ ریاستوں کو بھی شامل کر لیا جائے جن میں مسلم اکثریت ہے تو مسلم ہندستان کا کل رقبہ ۳ لاکھ ۷۶ ہزار مربع میل اور مجموعی آبادی ۵ کروڑ ۶۰ لاکھ ہوگی۔ اس تعداد میں ۳ کروڑ ۹۴ لاکھ مسلمان ایک کروڑ ۳۰ لاکھ ہندو اور ۱۶ لاکھ سکھ ہوں گے۔

لیکن اس کے برخلاف ہندو فیڈریشن کا رقبہ ۱۱ لاکھ ۵۱ ہزار مربع میل اور آبادی تقریباً ۲۸ کروڑ ہوگی، جس میں ۲۲ کروڑ ۳۶ لاکھ ہندو ۳ کروڑ ۴۷ لاکھ مسلمان ۱۰ لاکھ سکھ اور تقریباً ۷۰ لاکھ عیسائی ہوں گے۔

مسلم اقلیتوں کا سوال

پاکستان کی خاطر چار کروڑ مسلمانوں کی بھینٹ

پاکستان کی تمام اسکیموں کے مطالعہ کے بعد یہ چیز بدیہی طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ پاکستانیوں کے پاس مسلم اقلیتوں کے مسئلے کا کوئی حل موجود نہیں -

پچھلے صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ پنجاب بنگال اور کشمیر کے ہندو علاقوں کو خارج کر دینے کے بعد (بنگال کے خارج شدہ ہندو علاقے میں ۶۰ لاکھ اور پنجاب کے ۱۲ ہندو اضلاع میں ۲۹ لاکھ مسلمان آباد ہیں پھر مشرقی جموں میں بھی کئی لاکھ مسلمان بستے ہیں - غرضیکہ ان خارج شدہ علاقوں میں تقریباً ایک کروڑ مسلمان آباد ہیں جو پاکستانی علاقے سے نکل جائینگے) پاکستان میں صرف ۳ کروڑ ۹۴ لاکھ مسلمان آ سکیں گے اور بقیہ ۳ کروڑ ۴۱ لاکھ مسلمان (ہندوستان میں مسلمانوں کی کل آبادی ۷ کروڑ ۴۷ لاکھ ہے) ہندو ہندوستان میں رہ جائینگے، کیونکہ دیسی ریاستوں کے ایک کروڑ ۶ لاکھ مسلمانوں میں سے بھی صرف ۴۱ لاکھ مسلمان مسلم فیڈریشن میں آ سکیں گے، اور بقیہ ۶۵ لاکھ مسلمان ہندو فیڈریشن کے ماتحت ہو جائینگے ۔

غرضیکہ ہندوستان کے ہر ۷۷ مسلمان میں ۳۹ مسلمان تو پاکستان میں ہونگے اور اور ۳۸ مسلمانوں کو ناپاکستان میں رہنا پڑیگا - ریاستی مسلمانوں میں سے بھی ہر ۱۰۶ مسلمان میں سے بھی صرف ۴۱ مسلمان مسلم فیڈریشن میں ہونگے اور ۶۵ مسلمانوں کو ہندو فیڈریشن میں رہنا ہوگا -

ذیل میں ہم مسلم اقلیت کے صوبوں کی آبادیاں درج کرتے ہیں -

مسلم اقلیت کے صوبے

نام صوبہ	ہندو	مسلمان	صدفی
آسام	۴۹ لاکھ ۳۱ ہزار	۲۷ لاکھ ۵۵ ہزار	۳۰

	نام صوبہ	ہندو	مسلمان	فی صدی
۲	بہار	۲ کرور ۵۹ لاکھ	۴۱ لاکھ	۱۰
۳	بمبئی	۱ " ۵۶ "	۱۶ "	۷
۴	یو۔پی	۴ " ۱۰ "	۷۲ "	۱۴
۵	مدراس	۴ " ۱۲ "	۳۳ "	۷
۶	سی۔پی۔برار	۱ " ۲۳ "	۷ "	۴
۷	اڑیسہ	۶۵ "	۱ ۲۹۷ ہزار	۱
۸	اجمیر و دہلی	۱ " ۱۰ "	۳ ۲۵۰ ہزار	۳۲

میزان:- ۱۴ کرور ۹۴ لاکھ ۳۱ ہزار ۲ کرور ۱ لاکھ ۹ ہزار

مندرجہ بالا چارٹ میں آپ کو اقلیت کے برطانی صوبوں کے مسلمانوں کی مجموعی آبادی ۲ کروڑ ایک لاکھ ملے گی۔ اسمیں ۶۵ لاکھ اُن ریاستی مسلمانوں کو جوڑ دیجیے، جو ہندو فیڈریشن میں چلے جائینگے۔ پھر پنجاب کے خارج شدہ علاقے کے ۲۹ لاکھ اور بنگال کے خارج شدہ اضلاع کے ۶۲ لاکھ (یعنی ۸۹ لاکھ) مسلمانوں کو اس میں جوڑیئے۔ اس طرح غیر پاکستانی مسلمانوں کی تعداد ۳ کروڑ ۵۵ لاکھ ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد جموں کے مشرقی اضلاع کے مسلمانوں اور کچھ ادھر اُدھر کے مسلمانوں کو جنکی تفصیل دینے کی گنجائش نہیں، ملا کر غیر پاکستانی مسلمانوں کی تعداد ۳ کروڑ ۴۰ لاکھ پہنچتی ہے، جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں۔

اب غور فرمائیے کہ مسلمانوں کی اتنی بڑی آبادی جو سارے ہندوستان کے مسلمانوں کے نصف کے برابر ہے، 'ہندو راج' کے زیر اثر رہجاتی ہے اور پاکستان کی اسکیم سے اِسے کوئی فائدہ نہیں پہونچتا۔ اس کے صاف اور صریحی معنی یہ ہیں کہ مسلم لیگیوں اور پاکستانیوں کی انتہائی کوشش کے باوجود مسلم اقلیت کا مسئلہ جیوں کا تیوں رہا اور انکے پاس مسلم اقلیتوں کے مرض کی دوا نہیں۔

تبادلۂ آبادی بعض واضعین اسکیم نے تبادلۂ آبادی جیسی ناممکن العمل اور لغو تجویز کی آڑ میں اپنی ناکامی اور خفت مٹانے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر عبداللطیف صاحب نے تو یہ مشورہ دیدیا کہ مسلمان اور ہندو اپنی اپنی جگہ تبدیل کرلیں، جسکے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کے دوسو ملین (بیس کروڑ) انسان اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہ دیں اور کسی نئی جگہ جاکر بس جائیں۔ ظاہر ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر تبادلۂ آبادی اِس آسمان کے نیچے نہیں ہوسکتی اور اس طرح کی رائے دینے کا مطلب ایک عظیم الشان خلفشار اور عالمگیر تباہی و بربادی کو دعوت دینا ہے ایک دوسرے صاحب (اسد اللہ) تو اور دور کی کوڑی لائے۔ انھوں نے یہ حکم صادر فرما دیا کہ شمالی ہندوستان کے ہندو جنوبی ہندوستان میں چلے جائیں اور جنوبی ہند کے مسلمان شمالی ہند میں چلے آئیں۔ اِن حضرت نے یہ بھی سوچنے کی زحمت گوارا نہ فرمائی کہ شمالی ہندوستان میں کتنے ہندو بستے ہیں اور جنوبی ہند میں مسلمانوں کی آبادی کیا ہے۔ جنوبی ہند میں زیادہ سے زیادہ پچاس ساٹھ لاکھ مسلمان آباد ہیں۔ لیکن اسد اللہ صاحب اس جگہ پر جسے پچاس ساٹھ لاکھ مسلمان خالی کرینگے۔ شمالی ہندوستان کے تقریباً بارہ تیرہ کروڑ ہندوں کو بھیجدیتے ہیں۔ اقلیت کے مسئلے کا کوئی حل نہ دیکھتے ہوئے پنجابی صاحب نے بھی تبادلۂ آبادی کے مسئلے پر طبع آزمائی فرمائی ہے۔ آپ لکھتے ہیں:-

"پنجاب کے ہندو علاقوں کو خارج کردینے کے بعد سندھستان (پنجاب و کشمیر صوبۂ سرحد اور سندھ) میں مسلمانوں کی مجموعی آبادی ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ ہوگی سندھستان فیڈریشن کے قیام کے معنی یہ ہونگے کہ اتنے مسلمانوں کا ٹھکانا لگ گیا لیکن ۵ کروڑ ۱۹ لاکھ مسلمان چار ہندو اکثریت کے رحم وکرم پر رہجا ئینگے"

سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ ہندو اور مسلم علاقوں میں تبادلۂ آبادی کی تجویز کہاں تک قابل عمل ہے۔ مسلم پنجاب اور انبالہ ڈیویژن کے خارج شدہ علاقوں کے مابین تبادلۂ آبادی کوئی ناممکن العمل چیز نہیں۔ انبالہ ڈیویژن کا کرنال ضلع اور اناؤ اور گڑھ شنکر

(ہوشیارپور) کی تحصیلوں میں مسلمانوں کی آبادی ۱۲ لاکھ ۶۳ ہزار ہے۔ منجملہ ۵ کروڑ ۱۹ لاکھ مسلمانِ ہند کے جو ہندوستان کے مختلف حصص میں آباد ہیں، اِن مسلمانوں کو جو امبالہ وغیرہ میں آباد ہیں، تبادلۂ آبادی کے ذریعے ہندوں کے اقتدار سے بچایا جا سکتا ہے۔

بنگال کے مسلمانوں کی تعداد ۲ کرور ۸۰ لاکھ اور آسام کے مسلمانوں کی ۲۷ لاکھ ہے اسمیں شبہ نہیں کہ شمال و مغربی حصے کی علیحدگی کے بعد اگر یہ مسلم حلقے ہند و فیڈریشن میں رہے تو انکی حالت کا خطرناک ہو جانا لازمی ہے۔ لہذا ہند و فیڈریشن سے بچنے کیلئے ان کے سامنے صرف ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے یعنی وہ شمالی و مغربی مسلم فیڈریشن کے قدم پر چلیں۔ یہاں ہمیں غور کرنا ہے کہ بہار، اُڑیسہ اور آسام کے کتنے مسلمان بنگال فیڈریشن میں منتقل ہو سکتے ہیں۔ آسام کی مجموعی مسلم آبادی ۲۷ لاکھ ہے اور بہار اڑیسہ کی (مسلم آبادی) ۴۱ لاکھ۔ بنگال اور آسام کے مسلم حلقے کی علیحدگی کے بعد بہار اڑیسہ اور آسام کے ہندو حصص سے تبادلۂ آبادی کر کے ۳۴۸۲۸۹۰ مسلمانوں کو، جنہیں بنگال اور آسام کے مسلمان بھی شامل ہیں، مشرقی ہندستان میں بچایا جا سکتا ہے۔ ان تمام باتوں کا مطلب یہ ہے کہ اگر علیحدگی کو ہم وسیع معنوں میں استعمال کریں تو مسلمانوں کی جملہ ۷۷۶۸۰۰۰ آبادی میں سے ۶۱۷۵۳۰۸۰ مسلمانوں کی حفاظت کو مستقل کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد وسط اور جنوبی ہندوستان میں ۱۵۸۷۴۴۸۱۳ مسلمان رہ جائیں گے جنہیں مسلم حلقے میں لانا ممکن العمل ہے۔ (کانفڈریسی آف انڈیا صفحہ ۲۰۲ و ۲۰۳)

انتقالِ آبادی کے متعلق اس قدر بحث کرنے کے بعد پنجابی صاحب سنبھل جاتے ہیں اور اسکی غیر معقولیت کو مد نظر رکھتے ہوئے لکھتے ہیں :-

ہم نے اوپر جو اعداد و شمار رکھے ہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اس رائے کے ساتھ ہیں کہ ہندو، ہندوستان اور مسلم ہندوستان کے مابین تبادلۂ آبادی ہونا چاہیئے، بلکہ اسلئے کہ ہم ناظرین کو اس امر کا اندازہ لگانے کا موقع دیں کہ انتقالِ آبادی کسقدر طویل اور بھاری کام ہے اور اس سے کسقدر بے شمار انسان متاثر ہوتے ہیں اور اس عظیم الشان تجویز پر عمل پیرا ہونے میں خود مسلمانوں کی کیا حالت ہو جائیگی کیونکہ یہ اخراجات یقینی ملکی آمدنی سے ادا نہیں کئے جا سکتے

لہذا ہم تبادلۂ آبادی کے بغیر ہی مسلم اکثریت والے علاقوں کی علیحدگی کو ترجیح دینگے" (صفحہ ۲۰۱)

تبادلۂ آبادی کی غیر معقولیت کا اقرار کرتے ہوئے پنجابی صاحب آگے چلکر یہ بتلاتے ہیں کہ پاکستان کے بعد غیر پاکستانی مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہوگی -

"اس طرح علیحدگی کے ذریعہ ہندستان کے ۲۵۰۱۴۶۵۷ اور بنگال اور آسام کے ......۳۲ مسلمانوں کو ہندوؤں کے اقتدار سے چھٹکارا ملے گا، لیکن ۲۸۹۶۳۳۴۲ مسلمان ہندو صوبوں ہی میں رہ جائینگے" (" صفحہ ۲۰۲)

غرضیکہ یہ آخری طور پر تسلیم کر لیا گیا کہ کروروں مسلمانوں جو ہندو صوبوں میں بکھرے ہوئے ہیں اور جو پاکستانیوں ہی کی طرح امت اسلام میں ہیں، ظالم ہندوؤں سے انکی محافظت کا کوئی انتظام نہیں ہو سکتا اور انہیں اپنی قسمت پر قناعت کرتے ہوئے اپنی بربادی کا منتظر رہنا چاہیئے۔ لیکن پنجابی صاحب نے جو اعداد و شمار بتلائے ہیں وہ صحیح نہیں معلوم ہوتے آپ نے ہندستان کی مسلم آبادی ۲ کرور، ۵ لاکھ بتلائی ہے اور بنگال فیڈریشن کی دو کرور ۸۰ لاکھ یعنی دونوں ملاکر ۴ کرور ۸۷ لاکھ ہوئے۔ جو ہرگز صحیح نہیں پنجابی صاحب نے اپنی ۴۲۰ صفحات کی کتاب میں اعداد و شمار بہت کم استعمال کیے ہیں۔ یہاں معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے تمام مسلم اکثریت کے صوبوں کی آبادی جیبوں کی تینوں اٹھا کر رکھدی اور یہ بتلایا کہ اتنے مسلمان پاکستان میں آگئے۔ بنگال کی مسلم آبادی ۲ کرور ۵۰ لاکھ ہے، اور پنجاب کی ایک کرور ۳۳ لاکھ۔ پھر سندھ میں ۲۸ لاکھ سرحد میں ۲۲ لاکھ اور کشمیر میں ۲۸ لاکھ مسلمان بستے ہیں۔ انکی میزان ۴ کرور ۸۶ لاکھ ہوئی اور پنجابی صاحب نے یہی تعداد پاکستان اور بنگال فیڈریشن کے مسلمانوں کی بتلادی حالانکہ اس تعداد میں سے بنگال کا ہندو علاقہ الگ کرنے سے ۶۰ لاکھ اور پنجاب کا علاقہ الگ کرنے سے ۲۹ لاکھ مسلمان نکل گئے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ نکلے تو سلہٹ (آسام) کے ۱۶ لاکھ اور گوالپارا (آسام) کے تین لاکھ مسلمان اسمیں شامل بھی ہوئے۔ لیکن پھر مشرقی جموں اور کپورتھلہ کی مسلم آبادی کو بھی مجموعی تعداد سے وضع کرنا ہوگا۔

الغرض اس طرح پاکستان میں ۲ کروڑ ۴۹ لاکھ مسلمانوں سے زیادہ نہیں آسکتے اور بقیہ ۲ کروڑ ۴۷ لاکھ مسلمان ہندو فیڈریشن میں رہ جائینگے۔ غیر پاکستانی مسلمانوں کی تعداد بھی۔ پنجابی صاحب نے صحیح نہیں بتائی۔ غالباً اسمیں ۶۵ لاکھ ریاستی مسلمانوں کی تعداد شامل نہیں، جو ہندو فیڈریشن میں چلے جائینگے۔ بہرحال اگر پنجابی صاحب کے اعداد کو ایک لمحہ کے لئے صحیح مان بھی لیا جائے تو بھی تقریباً ۳ کروڑ مسلمان ہندو ہندوستان میں رہ جاتے ہیں جنکے لئے کوئی راہ نجات نہیں۔ پاکستان تو بن جاتا ہے لیکن، یو۔پی بہار، سی۔ پی، اڑیسہ، بمبئی، مدراس، آسام، راجپوتانہ اور دہلی کے مسلمانوں کی حالت جہیوں کی یتیوں رہتی ہے اور انکے کندھوں پر ایک "کٹر" "متعصب" ظالم اور کافر" راج کا جوا بدستور قائم رہتا ہے۔

پاکستان میں غیر مسلموں کی تعداد

پچھلے صفحے میں آپ نے دیکھ لیا کہ کتنے مسلمان، ہندو ہندوستان میں رہ جاتے ہیں۔ لہذا اب یہ بھی غور کرلینا چاہیئے کہ پاکستان یا مسلم ہندوستان میں کسقدر ہندو آتے ہیں۔ پنجاب میں ہندوؤں کی آبادی ۶۶ لاکھ ہے۔ جنمیں خارج شدہ ۱۲ ہندو اضلاع میں ۴۴ لاکھ ہندو نکل جائینگے اور ۲۲ لاکھ بچ رہینگے۔ اس ۲۲ لاکھ میں ۱۱ لاکھ سندھ اور ایک لاکھ صوبۂ سرحد کے ہندوؤں کو بھی جوڑ لیجئے۔ یعنی کل ۳۴ لاکھ پھر اس میں کشمیر کے تقریباً ۲ لاکھ کو بھی لے لیجئے جو کشمیر کے مسلم حصے میں رہ جائینگے۔ اس طرح پاکستان میں کل ۳۶ لاکھ ہندو رہ جائینگے۔ سکھوں کی آبادی ۳۲ لاکھ ہے انمیں ۱۸ لاکھ تو جالندھر ڈویژن معہ انبالہ ڈویژن اور امرتسر کے ساتھ ساتھ نکل آئینگے۔ باقی ۱۴ لاکھ سکھ پنجاب میں رہ جائینگے۔ اس میں صوبہ سرحد اور سندھ کے ۱ لاکھ سکھوں کو بھی جوڑ لیجئے۔ یعنی کل ۱۵ لاکھ سکھ پاکستان میں رہ جائینگے۔ غرضیکہ ہندو اور سکھ ملا کر ۵۱ لاکھ غیر مسلم، پاکستان میں ہونگے۔

بنگال میں ہندوؤں کی آبادی ۲ کروڑ ۱۶ لاکھ ہے۔ انمیں ایک کروڑ ۲۳ لاکھ

بردوان ڈویژن اور پریسیڈنسی ڈویژن کے خارج ہونے سے نکل جائینگے اور صرف ۹۲ لاکھ رہجائینگے لیکن تقریباً ۱۰ لاکھ ہندو سلہٹ کے، بنگال فیڈریشن میں شامل ہونے سے آبھی جائینگے۔ یعنی بنگال فیڈریشن میں کل ایک کروڑ ۲ لاکھ ہندو ہونگے اب پاکستان کے ۳۶ لاکھ اور بنگال فیڈریشن کے ایک کروڑ ۲ لاکھ ہندؤں کو جوڑ دیجئے تو ایک کروڑ ۳۸ لاکھ ہندو، مسلم فیڈریشن میں رہتے ہیں۔ انہیں ۱۵ لاکھ سکھوں کو بھی لے لیجئے تو مسلم حلقے میں غیر مسلموں کی مجموعی تعداد ایک کروڑ ۵۳ لاکھ ہو جاتی ہے۔ (عیسائی وغیرہ کے ماسوا)

پاکستانیوں نے شاید اِس پر غور نہ کیا کہ ہندو حلقے میں تو ۳ کروڑ ۴۷ لاکھ مسلمان رہ جاتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس مسلم حلقے میں صرف ایک کروڑ ۳۸ لاکھ ہندو رہتے ہیں

اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کا تو صرف ۵۶ فیصدی حصہ پاکستان میں آتا ہے اور ۴۴ فیصدی حصہ ہندو فیڈریشن میں رہ جاتا ہے۔ یعنی کل مسلمانوں میں تقریباً نصف تو پاکستان میں آتے ہیں اور نصف باہر رہجاتے ہیں۔ لیکن ۲۳ کروڑ ۹۱ لاکھ ہندوؤں میں سے صرف ایک کروڑ ۳۸ لاکھ ہندو مسلم حلقے میں آتے ہیں۔ یعنی ہر ۲۵ ہندو میں سے صرف ۲ ہندو مسلم فیڈریشن میں رہتے ہیں اور ۲۳ ہندو، ہندو فیڈریشن میں لیکن اس کے برخلاف ہر ،، مسلمان میں سے ۴۸ مسلمان کو ہندو حلقے میں رہ جانا پڑتا ہے۔

واقعی ہم پاکستانی بھائیوں کے دماغ اور عقل و فراست کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے

حقیقت یہ ہے کہ اِس پاکستانی اسکیم میں حماقت سے زیادہ دھوکہ اور فریب ہے۔ جو غریب ان پڑھ مسلم عوام کو اسلام کے نام پر دیا جا رہا ہے گذشتہ تین چار برسوں سے مسلم لیگ کے پریس اور پلیٹ فارم سے جن "بے کس اور مظلوم" مسلمانوں کا رونا رویا جا رہا تھا اور اُن پر کانگریس کے بے پناہ مظالم کی داستانیں سنائی جا رہی تھیں۔ آج انھیں اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو "ظالم کانگریس اور ہندوؤں" کے رحم و کرم پر چھوڑا جا رہا ہے۔ مسلم لیگ کو جو کچھ عروج ہوا، وہ اقلیتوں کے صوبوں میں ہوا

اور ان غریب مسلمانوں نے غلط یا صحیح یہ سمجھا کہ مسلم لیگ اُن کی محافظت کریگی۔مسلم لیگ نے کانگریس کی وزارت آتے ہی مسلمانوں پر کانگریسی حکومتوں کے مظالم کی فرضی داستانیں سنا سنا کر سارے ملک میں ایک عظیم الشان خلفشار برپا کر دیا۔کانگریسی حکومت کے مظالم کی لمبی فہرستیں شائع کی گئیں۔دنیا میں ظلم و تعدی کی کوئی قسم یا ایجاد باقی نہ رہی تھی جو کانگریسیوں نے بقول انکے، مسلمانوں پر نہ توڑی ہو۔ مسلمانوں کی جان و مال، عزت آبرو، کلچر، تمدن، زبان، اور حتیٰ کہ مذہب پر حملے کے کتنے ہی فرضی قصے گڑھے گئے اور مسلم لیگ کے پریس اور پلیٹ فارم سے بڑے شد و مد سے ان کا پروپگنڈا کیا گیا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھولے بھالے مسلمان ان کے جال میں آ گئے اور سادہ لوحی میں یہ سمجھے کہ مسلم لیگ، انکی حفاظت کریگی۔اسی لئے لیگ کو مسلم اقلیتوں کے صوبے میں زبردست عروج ہوا۔ بلکہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلم لیگ کا اتنا اثر قائم بھی نہ ہو سکا۔ لیکن وہی مسلم لیگ جسے مسلم اقلیتوں نے پرورش کر کے پروان چڑھایا اُس نے انہی غریب مسلمانوں کو دھوکہ دے دیا اور انہیں بلی کا بکرا بنا کر اُسی قصائی کے حوالہ کر دیا جس سے انہیں ڈرایا جاتا تھا۔

مسلم لیگ نے مسلم اقلیتوں کی محافظت کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ لیکن وہ اقلیتوں کے بدلے اکثریتوں کی حفاظت کرنے لگی۔مسلم لیگ کے خیال میں محافظت کی ضرورت یو۔پی کے ۱۴ فیصدی بہار کے ۱۰ فی صدی، مدراس کے ۷ فیصدی بمبئی کے ۸ فیصدی، سی۔پی کے ۴ فیصدی اور اڑیسہ کے ایک فی صدی مسلمانوں کو نہیں، بلکہ بنگال کے ۵۴ فی صدی پنجاب کے ۵۶ فی صدی، سندھ کے ۷۰ فی صدی اور سرحد کے ۹۰ فیصدی مسلمانوں کو ہے۔ پنجاب، سندھ اور سرحد کے بہادر پٹھانوں کی حفاظت کے لئے ایک پاکستان کا قلعہ تو بنانا چاہئے لیکن بیچارے، یوپی، بہار اور مدراسی مسلمانوں کی محافظت کی کوئی ضرورت نہیں۔انہیں خدا حافظ کہہ کر اُن ہی ظالم ہندوؤں کے حوالے کر دینا چاہئے، جنہوں نے، بقول انکے، مسلمانوں پر اس قدر مظالم ڈھائے ہیں۔ یہ ہے مسلم لیگ کی اسلامی سیاست۔

ایک زبردست فریب اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو پاکستانی حضرات یہ طفل تسلی دیکر

خوش کرنا چاہتے ہیں کہ اگر ہندو اکثریت کی حکومت اِن پر زیادتی کرے گی تو مسلم صوبوں کی ہندو اقلیتوں سے اِس کا انتقام لیا جا سکے گا۔ اور پھر ہندو اکثریت اپنے پاکستانی ہندو بھائیوں کا خیال کر کے مسلمانوں پر ظلم کرنے سے جھجکے گی۔ پنجابی صاحب لکھتے ہیں:۔

"یہاں پھر یہ دُہرا دینا مناسب ہوگا کہ ہم یہ علیحدگی ہندوؤں سے اپنی محافظت کیلئے چاہتے ہیں اور یہ ساتھ ہی ساتھ اسلئے بھی کہ یہ (پاکستان) ہندو صوبوں کو اُن کی مسلم اقلیتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے پر مائل کرے گا۔" (" ۲۰۷)

"اُن کے (ہندوؤں کے) ساتھ ایک مشترک فیڈریشن میں ہم ایسے ہی مجبور و لاچار ہوں گے جیسے وہ (مسلم اقلیت)۔ لیکن اس سے باہر ہم اس قابل ہوں گے کہ اُن کے (مسلم اقلیت کے) حق میں اپنا اثر و اقتدار کو استعمال کر سکیں اور اخلاق کا بدلہ اخلاق سے اور کینہ کا بدلہ کینہ سے دیں۔" (" ۲۱۳)

لیکن مصنفِ اسکیم شائد یہ بھول گئے کہ مسلم حلقے میں صرف ایک کروڑ ۲۸ لاکھ ہندو ہوں گے اور اُن کے مقابلے میں ہندو حلقے میں پونے چار کروڑ کی مسلم اقلیت ہوگی، جو سارے ہندوستان میں ہزاروں میل کی وسعت میں بکھری ہوئی ہوگی۔ اگر پاکستان میں ایک ہندو پر ظلم ہوگا تو ہندوستان میں ایک ہندو کا تین مسلمانوں سے انتقام لیا جا سکتا ہے۔ فرض کر لیجئے کہ ہندو آگے چل کر یہ فیصلہ کر لیں کہ مسلم اقلیتوں کو فنا کر دیا جائے، تو پاکستانی کیا کر سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ کریں گے کہ اپنی ایک کروڑ ۲۸ لاکھ کی ہندو اقلیت سے اس کا انتقام لیں اور اُسے فنا کر دیں۔ لیکن ۲۴ کروڑ کی ہندو قوم پر ڈیڑھ کروڑ ہندوؤں کے نکل جانے سے کیا اثر پڑیگا، لیکن اِس کے برخلاف پونے آٹھ کروڑ کی قوم میں سے اگر پونے چار کروڑ نفوس ختم ہو جائیں تو یہ قوم تو آدھی ہی رہ جائے گی۔

پھر ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ انتقام لینے کی طاقت کس میں ہوگی۔ پاکستان کے ۳ کروڑ ۹۴ لاکھ مسلمانوں میں یا ہندوستان کے ۲۲ کروڑ ۶۳ لاکھ ہندوؤں میں؟ اور پھر یہ تقریباً ۴ کروڑ پاکستانی مسلمان بھی ایک جگہ نہ ہوں گے بلکہ ملک کے دو کونوں میں ایک دوسرے سے ہزاروں میل کی دوری پر بنٹے ہوئے ہوں گے۔ اور ان کے درمیان ایک ہزار میل کی ہندو آبادی ہوگی۔ ہندو۔ ہندوستان، پنجاب اور سندھ سے لے کر بنگال تک

اور ہمالیہ سے لے کر راس کماری تک ایک عظیم الشان ملک ہو گا جو ۱۱ لاکھ ۱۵ ہزار مربعہ میل کی وسعت میں پھیلا ہو گا، جس کے پاس ملک کے بہترین حصّے، انبوہ دولت اور لاکھوں کی فوج ہو گی۔ لیکن مسلم ہندستان؟ - یہ ۳ لاکھ ۶۹ ہزار مربع میل کا ایک خطہ ہو گا جو ہندستان کے دو کونوں پر دو ٹکڑوں میں بٹا ہو گا اور اس کے پاس نہ زرخیز علاقے ہوں گے نہ دولت ہو گی اور نہ لاکھوں کی فوج۔

دنیا عالم اسباب ہے۔ یہاں جذبات اور باتوں سے کام نہیں چلتا۔ جب تک پاکستان کے پاس ہندو ہندستان کے مقابلے کے لئے کم سے کم ۲۵ لاکھ کی ایک فوج اور اس کے ساتھ ساتھ کھربوں روپئے کے ٹینک ہوائی جہاز، مسلّح موٹر کاریں اور جدید اسلحہ نہ ہوں، کس طرح کامیابی ہو سکتی ہے؟ جو پاکستان اپنی حکومت کا خرچ بھی پورا نہیں کر سکتا وہ کیا اپنی حفاظت کرے گا اور کیا اپنے غیر پاکستانی مُسلم بھائیوں کی؟

بہر حال شائد دنیا کا ابلہ ترین انسان اِس چیز پر یقین کر سکتا ہے، کہ پاکستان بن جانے کے بعد پاکستانی قوم کسی دوسری قوم کی مدد کر سکے گی۔ آجکل کی دنیا میں اگر کوئی چھوٹی قوم خود اپنی حفاظت کرے تو غنیمت ہے نہ کہ دوسرے ملکوں پر حملہ کرنا۔ اور وہ بھی آزاد ہندستان جیسے ملک پر۔ یہ کسی چھوٹی حکومت کے بس کی بات نہیں۔ پاکستان تو شائد اِس خطرے سے جانبر نہ ہو سکے کہ اس کی ایک جانب روس کی عظیم الشّان طاقت ہے اور دوسری طرف ہندستان کی نئی اُبھرتی ہوئی قوم۔ دنیا میں ایسی درمیانی (BUFFER) حکومتوں کا جو حال ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ شائد قدرت نے پاکستان کے لئے بھی یہی فیصلہ رکھ چھوڑا ہے۔

مسلم اقلیتوں کی بھینٹ نہ صرف یہ کہ مسلم لیگ اور پاکستانی حضرات مسلم اقلیتوں کو بیچ منجدھار میں چھوڑ دیتے ہیں، بلکہ انکی بھینٹ چڑھاکر خود فائدہ اُٹھانا بھی چاہتے ہیں۔ وہ یہ بھی گوارا نہیں کرسکتے کہ ہندوستانی مسلمان (یعنی غیر پاکستانی) اس وقت جس پوزیشن میں ہیں اس پوزیشن میں بھی باقی رہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمان ایک ایسی ذلیل اقلیت ہوکر رہے کہ سوائے لکڑی کاٹنے اور کہاری کرنے (DRAWERS OF WATER AND HEWERS OF WOOD) کے وہ کسی دوسرے کام کی باقی نہ رہے۔

ہندو صوبوں میں مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کے ساتھ ساتھ ویٹیج (WEIGTAGE) بھی ملا ہوا ہے۔ ہندو اکثریت کے تمام صوبوں میں مسلمانوں کو انکے تناسب آبادی سے دوگنا اور سہ گونہ ویٹیج حاصل ہے، جو یقینی اکثریتوں کے حقوق کی قربانی کرکے دیا گیا ہے۔ مسلمان اقلیتوں کو یہ ویٹیج اِس معاہدے کی بناپر حاصل ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں ہندو اقلیت کو بھی اِسی طرح کے حقوق ملیں گے۔ مثال کے طور پر یو۔پی۔ ہی کو لے لیجئے، یہاں مسلمانوں کی آبادی ۱۴ فی صدی ہے۔ لیکن انھیں یو۔پی۔ اسمبلی کی ۲۲۸ نشستوں میں ۶۴ نشستیں ملی ہوئی ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اپنی آبادی سے دوگونہ یعنی ۲۸ فی صدی نشستیں مسلمانوں کے قبضے میں ہیں۔ پھر بھی تناسب میونسپلٹیوں ڈسٹرکٹ بورڈوں اور ملازمتوں میں بھی ہے۔ ہر جگہ ویٹیج کے مطابق مسلمانوں کو ان کی آبادیوں سے دوگونہ بلکہ کہیں کہیں تو سہ گونہ حقوق ملے ہوئے ہیں۔ یو۔پی کے پانچ وزیروں میں دو مسلمان وزیر تھے۔ یعنی ۴۰ فیصدی کے قریب۔ حالانکہ یو۔پی میں مسلمانوں کی آبادی صرف ۱۴ فیصدی ہے۔ اسیطرح بہار کی ۱۵۲ نشستوں کی اسمبلی میں ۴۰ مسلمان ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمانوں کی نشست کم وبیش ۲۷ فیصدی ہے۔ حالانکہ صوبہ بہار میں مسلمانوں کی آبادی کل ۱۰ فیصدی ہے۔ ذیل کے اعداد سے معلوم ہوگا کہ مسلمان کس صوبے میں کتنا فیصدی ہیں اور انہیں ویٹیج کے تحت کمیونل اوارڈ میں ــــ کتنی نشستیں ملی ہوئی ہیں۔

ہندو صوبوں میں مسلم اقلیتوں کو ویٹیج

نام صوبہ	نشستوں کی تعداد (اسمبلی میں)	مسلمان	تناسب (فیصدی)	اصل آبادی کا تناسب (فیصدی)
صوبہ متحدہ	۲۲۸	۶۴	۲۸	۱۴
بہار	۱۵۲	۴۰	۲۷	۱۰
اُڑیسہ	۶۰	۴	۷	۱
صوبہ متوسط	۱۱۲	۱۴	۱۲½	۴
بمبئی	۱۷۵	۲۹	۱۷	۷
مدراس	۲۱۵	۲۸	۱۳	۷

یہ ویٹیج یقینی اکثریتوں ہی کی قربانی پر انکی نشستوں سے کاٹ کر مسلمانوں کو دیئے گئے، اور ہندو اکثریت نے اسے اسی لیے منظور کیا ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں ہندو اقلیتوں کے ساتھ بھی ایسا ہی برتاؤ ہو۔ چنانچہ ہندو اقلیتوں کو بھی مسلم صوبوں میں انکی آبادی سے دوگونہ اور سہ گونہ ویٹیج ملا ہوا ہے۔ لیکن پاکستان میں جو ۲۰ فیصدی ہندو اور ۴ فیصدی سکھ۔ یعنی جملہ ۲۴ فی صدی غیر مسلم بچ جاتے ہیں انہیں پاکستانی حضرات ویٹیج دینے سے انکار کرتے ہیں۔ پنجابی صاحب اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"غیر مسلم اقلیتیں جو مسلم صوبوں میں ہیں وہ اپنی تعداد کے لحاظ سے مسلم اکثریتوں کے قریب قریب مقابل ہیں بلکہ اقتصادی حیثیت سے تو وہ مسلم اکثریتوں سے بہتر ہیں۔ ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلم اقلیتوں کو ویٹیج دینے کے عوض اگر ان ہندو اقلیتوں کو مسلم صوبوں میں ویٹیج دیا گیا تو اس سے ہندو اقلیتیں مسلمان اکثریتوں کے مدمقابل ہو جائیں گی۔ ہندو صوبوں میں مسلم اقلیتیں اپنی تعداد اور اقتصادی حالت کے لحاظ سے بہت زیادہ کمزور ہیں اور انھیں ویٹیج مل جانے سے انکی ویسی ہی حالت

نہیں ہو جاتی جیسی ہندو اقلیت کو ویٹیج ملنے سے ہوتی ہے۔ ہندو اقلیتیں مسلم صوبوں میں ویٹیج لیکر جتنا فائدہ اُٹھاتی ہیں۔ اتنا فائدہ مسلم اقلیتیں ہندو صوبوں میں ویٹیج ملنے پر نہیں اُٹھاتیں۔ مسلم صوبوں میں ہندو اقلیتوں کو ویٹیج دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثریت سے اِنکی برابری ہو جاتی ہے۔ لیکن ہندو اکثریت کے صوبوں میں ایسا ہی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا" (کانفڈریسی آف انڈیا۔ صفحہ ۲۰۶)

پھر اس مسئلے کو صاف کر کے کھلّم کھلاّ فرماتے ہیں:۔

"ہندو صوبوں میں مسلم اقلیتوں کے لئے ویٹیج مہیا کرنے کا یہ مطلب ہوگا کہ شمالی ومغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو، دوسرے صوبوں کے دینی بھائیوں کو کوئی خاطر خواہ امداد پہنچائے بغیر خواہ مخواہ مقامی ہندوؤں کی زیادتیاں اور جبر سہنا ہوگا۔ اقلیتیں خواہ ہندو ہوں یا مسلمان اپنے اپنے صوبوں میں ہمیشہ ویٹیج کی خواہشمند ہونگی اور اس کے حصول کے لئے فتنہ وفساد برپا کریگی۔ یہ کہیں زیادہ بہتر ہوگا کہ ہم اقلیتوں کی اِن توقعات کو ہمیشہ کے لئے مسترد کر دیں۔ ورنہ یہ (ویٹیج) ہندوستان کی آزادی کی راہ کو ہمیشہ مسدود رکھے گا اور اسے (ہندوستان کو) اقوام کی کامن ولتھ میں برابر کا شریک نہ بننے دیگا" (〃 〃 ۱۵۴)

حد ہو گئی! اگر یہی باتیں کوئی کانگریسی کہتا اور اقلیتوں کو ویٹیج دینے کی مخالفت کرتا تو سارے ہندوستان میں اِسے مسلمانوں کا دشمن اور فرقہ پرور کہا جاتا۔ لیکن جس ویٹیج کے لئے تمام مسلم زعماء نے (بشمول قائدِ اعظم) دس سال سے ہندوستان میں شور مچا رکھا ہے۔ اور جسے ہندو اکثریت سے لڑ کر مسلمانوں کو دلوایا گیا، آج وہی ویٹیج محض اس وجہ سے کہ پاکستان کی اقلیت کو ویٹیج نہ دینا پڑے، آزادی کی راہ کا ایک روڑا بن گیا ہے۔ اور یہ صرف اس لئے کہ پاکستان کے ۱۴ فی صدی ہندو اور سکھوں کو کہیں ۲۸ فی صدی نہ دینا پڑے۔ خود غرضی دیکھیئے کہ اپنے ذرا سے فائدے کے لئے۔ بہار، یو۔پی، سی پی، مدراس، اڑیسہ، آسام کے پونے چار کروڑ مسلمانوں کے حقوق کی بھینٹ چڑھائی جا رہی ہے وہ اقلیتوں کو

اس خوف سے ویٹیج دینے کے لئے تیار نہیں کہ ویٹیج ملنے کے بعد یہ اقلیتیں مسلمانوں کے مدمقابل ہوجائینگی۔ اسی لئے تو انھوں نے انبالہ ڈویژن اور کانگڑا ضلع کو پنجاب سے خارج کیا۔ اب وہ ۸۰ فی صدی ہندو اور ۶ فی صدی سکھ۔ یعنی ۱۴ فی صدی غیرمسلم اقلیتوں کو ویٹیج دیکر ۸۰۲ فی صدی بنانا نہیں چاہتے۔ وہ ۸۲ فی صدی ہونے پر بھی ۱۴ فی صدی سے دہشت زدہ ہیں۔ لکھتے ہیں:-

"ہم نے مشرقی پنجاب سے ہندو علاقوں کے اخراج کا اس لئے مشورہ دیا ہے کہ ہم ایک طاقتور مرکزی حکومت اور اس کے ساتھ پنجاب میں ایک مضبوط مقامی حکومت بنانا چاہتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہم مقامی ہندؤں کے، مسلمانوں کے خلاف، سازش کرنے کے مواقع بھی کم کر دینا چاہتے ہیں"۔ (ص ۲۵۸)

پاکستان اور پنجاب میں طاقتور حکومت بنانے پر کسے اعتراض ہو سکتا ہے، لیکن پاکستان میں غیرمسلم اقلیتوں کو ۱۴ فی صدی ویٹیج نہ دینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یو۔ پی۔ بہار۔ سی۔ پی، مدراس بمبئی۔ آسام۔ اور اڑیسہ میں مسلمانوں کو جو ویٹیج ملا ہوا ہے وہ چھن جائیگا اور اس کے مطالبے کے لئے کوئی اخلاقی بنیاد نہ رہ جائیگی۔ پاکستان کی مسلمان اکثریت، اقلیت کو ۱۴ فیصدی دیکر بھی ۶۰ فیصدی رہ سکتی ہے، اور اس طرح ہندو صوبوں میں مسلم اقلیتوں کی محافظت کے لئے ایک سازگار فضا پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن پاکستانی بھائیوں کو اپنے مطلب سے مطلب ہے۔ وہ تو ایک مضبوط حکومت بنانا چاہتے ہیں جو ۸۲ فی صدی کی اکثریت سے کم میں نہیں بن سکتی۔ اسلام کی یہ نام لیوا قوم ۶۰ فی صدی کی اکثریت میں رہنے کے بعد بھی اپنے کو کمزور محسوس کر رہی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

پنجابی سازش ہمیں تو پنجابی صاحب کی اس اسکیم کے پیچھے ایک زبردست پنجابی سازش کا شبہہ ہوتا ہے۔ پنجاب کی حکومت کو ایک زبردست اقلیت سے واسطہ پڑا ہے جو ۴۴ فی صدی ہے۔ ۴۴ فی صدی کی اقلیت، اقلیت نہیں کہی جا سکتی، بلکہ اس کا درجہ مساوات کا ہے۔ اسی لئے سر سکندر کی حکومت کو، ان اقلیتوں کو راضی رکھنے میں بڑی

بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور انھیں یہ چیز ہر وقت سامنے رکھنی پڑتی ہے کہ کہیں ہندو اور سکھ ان سے ناراض نہ ہو جائیں، اور ان کی حکومت کمزور نہ ہو جائے۔ اس لئے پنجابی مسلمان ایک عرصے سے اس امر کے لئے کوشاں ہیں کہ پنجاب میں کسی طرح انکی مضبوط اکثریت ہو جائے۔ اِس مقصد کے حصول کے لئے انھوں نے گول میز کانفرنس کے زمانے میں انبالہ ڈویژن کے ہندو حلقے کو پنجاب سے نکال دیئے جانے کی زبردست کوششیں کیں۔ پنجابی صاحب اِس سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

"گول میز کانفرنس کے دوران میں اگر سرزمینِ سندھ کو ہندوستان سے علیحدہ نہ کیا جا سکتا تھا تو پنجاب کی مشرقی حدود میں یقینی ردّوبدل ہو سکتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے کوئی شخص بھی اس علیحدگی کی مصلحت کو نہ سمجھ سکا یا پھر نمبر ۱۰ ڈاؤننگ اسٹریٹ پر اس امر کے لئے کافی دباؤ نہ ڈال سکا" (" ۔ صفحہ ۲۴۹)

یعنی اگر گول میز کانفرنس کے وقت اربابِ حل وعقد پنجاب کے مشرقی اضلاع کی علیحدگی کی 'مصلحت' سمجھ لیتے اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں انبالہ ڈویژن پنجاب سے الگ کر دیا جاتا تو اِس وقت نہ اس تحریکِ پاکستان کی ضرورت پڑتی اور نہ اسلام ہی خطرے میں آتا اور نہ ہندو مسلمان دو قومیں بنائی جاتیں۔

میرا مقصد یہ نہیں کہ پنجاب میں مسلم اکثریت کو مضبوط نہ ہونا چاہیئے۔ مسلمانانِ پنجاب انبالہ کو پنجاب سے علیحدہ کرنے کا نہایت جائز طور پر مطالبہ کر سکتے ہیں، بالکل اِسی طرح جسطرح سندھ کی علیحدگی کا مطالبہ کیا گیا۔ اِس پر ہندو بھی ٹھنڈے دل سے غور کر سکتے تھے۔ لیکن اس کے لئے ملک کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنا، ہندو مسلمانوں کے ایک ہزار برس کے روابط پر پانی پھیرنا اور مسلمانوں کو اسلامی حکومت قائم کرنے کا سبز باغ دکھانے کا کیا فائدہ۔

بہر حال پنجابی لیڈروں نے دیکھا کہ پنجاب کی حکومت کو مضبوط کرنے کے لئے پاکستان کا نعرہ لگانا ضروری ہے۔ یہ اس لئے بھی کہ امبالہ وغیرہ کی علیحدگی پر بھی مسلمانوں کا تناسب ۵۶ فی صدی سے بڑھکر ۶۲ فی صدی ہی تک جاتا ہے اور ۳۴ فی صدی کی اقلیت پھر بھی رہجاتی

ہے۔ اس لئے انھوں نے اپنے ساتھ ۲۲ لاکھ سرحدی، ۲۸ لاکھ سندھی اور تین لاکھ بلوچی مسلمانوں کو ملانا چاہا، تاکہ انکی اکثریت نہ صرف متفقین بلکہ مضبوط ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ کسی ایسے فیڈریشن میں جسمیں سندھی، بلوچی، سرحدی اور پنجابی مسلمان شامل ہوں اسمیں ہر لحاظ سے، کیا بلحاظ تعلیم کیا بلحاظ آبادی اور کیا بلحاظ دولت وثروت، پنجابی مسلمان ہی چھائے رہیں گے۔ اور اس طرح پاکستان اور اسلام کے نام پر نہ صرف ایک مضبوط پنجابی حکومت بلکہ ایک مضبوط پنجابی سامراج قائم ہو سکے گا۔

پاکستان میں ۳ لاکھ بلوچی، ۲۲ لاکھ سرحدی اور ۲۸ لاکھ سندھی مسلمان ہوں گے، پھر ۳۸ لاکھ غیر مسلم یعنی ہندو اور سکھ ہونگے۔ لیکن ان چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کے مقابلے میں ایک کرور ۲۱ لاکھ پنجابی مسلمان ہونگے۔ یعنی اگر پاکستان فیڈریشن میں ایک لاکھ آبادی پر ایک ممبر رکھا گیا تو اس لحاظ سے پاکستان فیڈریشن میں ۲۸ سندھی، ۲۲ سرحدی، ۳ بلوچی، ۳۸ غیر مسلم اور انکے مقابلے میں ۱۲۱ (ایک سو اکیس) پنجابی ممبر ہونگے۔ یہ ممکن نہیں کہ سرحدی بلوچی، سندھی اور غیر مسلم مل کر ایک بلاک بنائیں اور حکومت چلائیں۔ وہ آپس میں اس قدر مختلف ہیں کہ انکے ملنے کا کوئی امکان نہیں۔ لیکن پنجابی مسلمان یقینی انکے مقابلے میں متحد ہونگے اور ۱۲۱ اراکین کا انکا ایک ٹھوس بلاک ہوگا۔ علاوہ ازیں اگر پاکستان کے مندرجہ بالا تمام عناصر مل بھی جائیں تو انکی مجموعی آبادی ۸۹ لاکھ ہوتی ہے۔ یعنی انکے کل ۸۹ ہی ممبر ہونگے۔ کشمیر کے مسلمانوں کو اس میں اس وجہ سے نہ رکھا کہ وہاں انتخاب ہوگا یا نامزدگی ہوگی یہ پتہ نہیں۔ کشمیر کے حکمران ہندو ہیں اور وہ ہندو کو نامزد کرینگے یا مسلمان کو یہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

غرضیکہ اس طرح پنجابی صاحب ایک شاندار پنجابی سامراج کے قیام کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ پنجابی مسلمانوں اور سندھی اور سرحدی مسلمانوں میں ایک طرح کی پرانی دشمنی بھی چلی آرہی ہے، کیونکہ پنجابیوں نے تعلیم یافتہ ہونیکے سبب سندھ اور سرحد کی تمام ملازمتوں پر قبضہ کر رکھا ہے، اور پنجابی مسلمانوں کے خلاف سندھ اور سرحد کے مسلمانوں میں وہی فیلنگ ہے جو بہاریں بنگالیوں کے خلاف ہے۔ لیکن سندھ اور سرحد کی نوکریاں لینے سے انکا جی نہ بھرا تو اب ان پر

حکومت بھی کرنا چاہتے ہیں۔

"کانفڈریسی آف انڈیا" میں پنجابی صاحب کی یہ نیت اکثر جھلک جاتی ہے۔ جو کہ مندرجہ ذیل عبارت سے ظاہر ہے۔ امبالہ ڈویژن کی علیحدگی کی ضرورت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ہمیں پنجاب کی صوبائی سرحدوں کے ردّو بدل پر قناعت کرلینی چاہیئے۔ جیساکہ میں نے اوپر مشورہ دیا ہے۔ اس سے یہ فائدہ بھی ہوگا کہ شمالی ومشرقی (پاکستان) کی دوسری وحدتوں (UNITS) کو یہ شبہہ کرنے کا موقعہ نہ رہیگا کہ چونکہ پنجابی مسلمانوں کو پنجاب میں غیر مسلم تنگ کرتے ہیں اس لئے وہ اپنے فائدے کے لئے علیحدگی چاہتے ہیں تاکہ انکی پوزیشن مضبوط ہوجائے" (" صفحہ ۲۵۶)

آخر یہ غلط فہمی دور کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ آپ جب خالص اسلامی مقصد سے کام کررہے ہیں تو سرحد اور سندھ والے بھی تو مسلمان ہیں اُنکا بھی تو یہی مقصد ہے؛ لیکن نہیں، سندھ اور سرحد کے بھائی ان حضرات کو خوب پہچانتے ہیں، اسی لئے، پنجابی صاحب کو بار بار شبہہ دور کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

اسی ایک مقصد یعنی۔ پنجابی حکومت کو مضبوط کرنے کے لئے تو اُنھوں نے پونے چار کرور مسلم اقلیتوں کو قربان کردیا، اپنے صوبے سے ۸ ضلع نکال دیئے، انکی آمدنی کھوئی اور پھر ان آٹھ ضلعوں کے ۱۲ لاکھ مسلمانوں کو بھی ہندوں کے ساتھ ساتھ علیحدہ کردیا۔ اور انھیں بھینٹ چڑھادی۔

ان تمام کڑیوں کو ملاکر ناظرین غور کریں کہ پنجابی لیڈروں کی طرف سے ہمارا شبہہ کہاں تک بجا ہے، اور وہ ایک پنجاب کو درست کرنیکے لئے اور پنجابی سامراج قائم کرنے کے لئے کہاں تک مسلم مفاد کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

آگے چل کر تو وا غمیں پاکستان کچھ ایسی باتیں کہتے ہیں کہ انکی بے پناہی کا عالم مسلم مفاد سے غداری عیاں ہوجاتی ہے پنجابی صاحب لکھتے ہیں:

"ہم یہ بھی امید کرتے ہیں کہ ہمارے بھائی جو ہندو صوبوں میں ہیں وہ صورت حال کا جائزہ لیں گے اور صرف اس لئے کہ ایک وفاقی ہندوستان میں، جس پر ہندو چھائے رہیں گے، ہمارا ان کا ساتھ رہے، وہ ہماری گردن میں لٹکے نہ رہیں گے۔" (ر۔ صفحہ ۲۱۲)

اللہ اکبر! کیا خود غرضی ہے۔ بالکل میدانِ حشر کا نقشہ ہے۔ پنجابی صاحب مسلم اقلیتوں کو سمجھا رہے ہیں کہ تم ہمارے گلے نہ پڑو، اور تمہارا جو بھی حال ہو، ہمیں پاکستان کا قلعہ بنا کر محفوظ ہو جانے دو آگے چل کر صوبہ بنگال میں علیحدہ فیڈریشن بنانے کا مشورہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"وہ لوگ جو اس عالمگیر تباہی سے بچ سکتے ہیں، جو مشترک فیڈریشن میں یقینی آنے والی ہے، انھیں علیحدگی اختیار کر کے اپنی محافظت کر لینی چاہیے اور صرف اس لئے پس و پیش نہ کرنا چاہیے کہ چند مسلمان جو علیحدہ نہیں ہو سکتے وہ اس طوفان میں پیچھے چھوٹ جائیں گے۔ مشرقی و مغربی ہند اور آسام و بنگال دونوں کو جلد سے جلد علیحدگی کی چھت کے نیچے پناہ گزین ہو جانا چاہیے۔" (ر۔ صفحہ ۲۰۹)

کیسی بے پناہی اور نفسی نفسی کا عالم ہے، ہندو ایک طوفان کی طرح بڑھتے چلے آ رہے ہیں بالکل ہلاکو اور چنگیز کی طرح۔ جو لوگ اس طوفان سے بچ سکتے ہیں وہ پاکستان کے قلعے میں پناہ گزین ہو جائیں۔ اور جنکی تقدیر ہی میں تباہی لکھی ہے انکے لئے کیا کیا جا سکتا ہے انھیں چاہیے کہ اپنی بربادی کی گھڑی کا انتظار کریں۔ پونے چار کروڑ مسلمانوں کی خاطر چار کروڑ پاکستانی مسلمان اپنے آپ کو اس طوفان میں دھکیل نہیں سکتے۔ یہ ہے اسلامی شجاعت و بہادری کا نمونہ۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ اس وقت مسلمان ہندوؤں سے اسی طرح لرزہ براندام نظر آتے ہیں جس طرح ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے وقت ہندو خوف زدہ تھے۔

اسلامی اخوت اور اسلامی قومیت کی جس کی پاکستان اور لیگی بھائی دہائی دیتے ہیں اس سے بڑھکر اور کون سی مثال مل سکتی ہے۔

وہی مذہب کی آڑ پنجابی صاحب ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

"اگر یہ مسلم حلقے (پاکستان اور بنگال) اپنی دو الگ الگ ریاستیں بنالیں تو ۲۸۹۶۳۳۴۳ مسلمان ہندو ہندوستان میں چھوٹ جائیں گے۔ ہندوستان میں اسلام کی مزید توسیع و اشاعت کے لئے ہم ان کے تبادلۂ آبادی کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے۔" (" صفحہ ۴)

ڈاکٹر سید عبداللطیف کی اسکیم پر رائے زنی کرتے ہوئے آگے چل کر لکھتے ہیں:-

یہ (اسکیم) ہندو حلقے کے مسلمانوں کو تمام کے تمام مسلم حلقے میں واپس بلا لینے کے حق میں ہے" اور یہ ایک ایسی چیز ہے جو ہندوستان میں اسلام کی مزید توسیع کے لئے سم قاتل ہے۔"

(" صفحہ ۷)

آخر "اسلام" کا لفظ پاکستانیوں کے کام آہی گیا۔ مسلم اقلیتوں سے اس غداری کو اور کس طرح چھپایا جاسکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ مذہب کا نام استعمال کیا جائے۔

ملاحظہ ہو! ہندو اکثریت کے طوفان سے ڈر کر خود تو اپنا سر چھپانے کے لئے پاکستان کے ڈربے میں گھسنا چاہتے ہیں لیکن اسلامی تبلیغ و اشاعت کا جھنڈا مسلم اقلیتوں کے ہاتھ میں سونپ دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اگر تم بھی اسی ڈربے میں گھس گئے تو ہندوستان میں اسلام کو نقصان پہنچے گا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہندو صوبوں کی مسلم اقلیتوں کی حالت بہت خطرناک ہے۔

دیکھا آپ نے! یہ حضرات مسلم عوام کو کس قدر احمق سمجھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ مسلمان عوام کو بڑے سے بڑے دجل اور فریب میں مبتلا کرنے کے لئے بس ایک بار "اسلام" کا نام لے لینا کافی ہے۔ اور پھر جو چاہے کیجئے، کوئی مسلمان چوں بھی نہ کرے گا۔

لیکن پاکستانیوں نے یہ نہ سوچا کہ اگر "ہندو ہندوستان" میں اسلام کی تبلیغ قانوناً جرم قرار دیدی گئی تو کیا ہوگا؟

بہر حال یہ چیز مسلم ہو جاتی ہے کہ بیچارے پونے چار کروڑ مسلمانوں کے لئے سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں کہ وہ ہندو اکثریت کی چکی میں جس طرح اب پس رہے ہیں (بقول لیگی حضرات) اسی طرح ابدالآباد تک پستے رہیں۔ پاکستانی اسکیم میں ان کی حفاظت

کے لئے کوئی راستہ نہیں بلکہ پاکستان بننے پر انھیں جو حقوق اس وقت ملے ہوئے ہیں وہ بھی ان سے چھن جائیں گے۔ پاکستانی بھائی غیر پاکستانی مسلمانوں کو توقع کی ایک ہلکی سی جھلک دکھلاکر خوش کردینا چاہتے ہیں۔یعنی پاکستان بن جانے پر ہم تمہاری مدد کریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک پاکستان نہ بنے۔مسلم اقلیتوں کی حفاظت بھی نہیں ہوسکتی۔ ملاحظہ ہو مسلم لیگ کی عیاری اپنی ناکامی اور نااہلی کو کس قدر خوبصورتی سے چھپایا گیا۔ تین چار سال کی کوششوں کے باوجود مسلم لیگ مسلم اقلیتوں کا مسئلہ حل کرنے میں ناکامیاب ہوئی۔ مسلمانوں کی محافظت کی ذمہ داری جو اُس نے لی تھی اُسے پورا نہ کرسکی۔ اب مسلمانوں کو کیا منہ دکھائے۔ لیکن اس کے پاس مذہب کا چٹکلہ موجود تھا۔ فوراً اس نے مسلمانوں کے سامنے پاکستان کی جنت پیش کردی تاکہ مسلمان اِسی میں مگن رہیں۔ اگر یہ جنّت حقیقت میں بدلی تو مسلم اقلیتوں کی حفاظت بھی ہوسکے گی۔ ورنہ انھیں اسی اُمید موہومہ میں اپنی زندگی گذارنی پڑے گی۔

پاکستان کی اقتصادی، مالی اور سیاسی دقتیں

۱- سندھستان میں صنعتی ترقی کے امکانات

موجودہ دور میں کسی ملک کی ترقی میں اس کی صنعتی ترقی بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے صنعت وحرفت کو جس قدر زیادہ فروغ ہوگا۔ ملک اتنا ہی آگے بڑھے گا۔ یورپ اور امریکہ کی موجودہ ترقیوں کا واحد سبب ان کی صنعتی ترقی ہے، جس کی تاریخ یورپ کے صنعتی انقلاب INDUSTRIAL REVOLUTION سے شروع ہوتی ہے صنعتی ترقی ہی پر ملک کی تجارت، خوشحالی اور طاقت کا انحصار ہے۔ آج دنیا میں ہر ملک کی جگہ اُس کی صنعتی ترقی کے تناسب سے مقرر کی جاتی ہے۔ صرف غلہ پیدا کرنے سے کوئی ملک آگے نہیں بڑھ سکتا۔ موجودہ دنیا میں اکثر زراعتی ممالک کا صرف یہ مصرف رہ گیا ہے کہ وہ صنعتی ممالک کی نوآبادیاں بن کر رہیں، اور انھیں خام پیداوار کی رسد پہنچایا کریں۔

لہذا ہمیں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ہندستان سے علیحدگی کے بعد پاکستان میں صنعت وحرفت کی ترقی کے کیا امکانات ہیں۔ لیکن اس چیز پر غور کرنے سے قبل ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ پاکستانی علاقے میں اس وقت صنعت وحرفت کا کیا حال ہے۔ ذیل میں ہم ایک چارٹ دیتے ہیں جس میں پاکستان اور کل ہندستان کے کارخانوں کے اعداد وشمار دئے گئے ہیں:-

صنعت وحرفت میں پاکستان کی پسماندگی

(اعداد وشمار ۱۹۴۶ء کے دئے گئے ہیں)

	کارخانوں کی قسم	پاکستان میں	ہندستان میں	کل
۱	کپڑے کی ملیں	۹	۳۳۱	۳۴۰
۲	جوٹ " "	۰	۱۰۳	۱۰۳
۳	چینی " "	۹	۲۳۸	۲۴۷
۴	سلک " "	۴	۳۹	۴۱
۵	اُون " "	۴	۶	۱۰
۶	ہوزری " "	۴۲	۶۹	۱۱۱

مندرجہ بالا اعداد سے آپ کو صنعت و حرفت میں پاکستان کی پسماندگی کا بخوبی اندازہ ہوگیا ہوگا۔ پنجاب کے سوا پاکستان کے دوسرے صوبوں کی حالت تو اس سے بھی ناگفتہ بہ ہے۔ سندھ ایک ریگستانی علاقہ ہے۔ صوبہ سرحد پہاڑی ہے، اور کشمیر کی بھی تقریباً یہی حالت ہے۔ یہ تینوں صوبے تمامتر زراعتی ہیں اور صنعت میں ان کا کوئی شمار نہیں۔ جو کچھ کل کارخانے ہیں وہ لے دیکے پنجاب ہی میں ہیں، جن کے اعداد اوپر درج کئے گئے۔ علاوہ اس کے پاکستان میں اُن صنعتوں کا ایک کارخانہ بھی نہیں جو کپڑا، جوٹ اور چینی سے بھی زیادہ ضروری ہیں۔ یعنی لوہا، ٹین، تار (CABLE) اور سمنٹ وغیرہ۔ انسانی زندگی کی سب سے اہم ضرورت لوہا ہے۔ اسی سے ریل، جہاز، ہوائی جہاز، ٹینک، اسلحہ، بجلی کے سامان، تعمیرات اور جملہ قسم کی مشینیں بنتی ہیں۔ غرضیکہ ایک ملک کی جملہ قسم کی ترقیوں کا مدار لوہے پر ہے لیکن پنجاب میں لوہے کا ایک کارخانہ بھی موجود نہیں۔

غرضیکہ پاکستان فی الحال صنعتی ترقی کے اُس درجے پر بھی نہیں جسے ہم ابتدائی کہہ سکتے ہیں۔ آئیے اب دیکھیں کہ پاکستان میں صنعتی ترقی کے کیا امکانات ہیں اور انڈسٹری کے لئے جن اسباب کی ضرورت ہے وہ پاکستان میں کس حد تک پائے جاتے ہیں۔

کسی ملک کو صنعتی بنانے (INDUSTRIALISE) کے لئے پانچ چیزیں بہت ضروری ہیں:۔ (۱) سرمایہ (۲) خام اشیاء (۳) مشینری اور دوسرے آلاتِ پیداوار۔ (۴) کاریگری (TECHNICAL SKILL) اور (۵) بازار (MARKET)۔ آگے ہم اِن پر یکے بعد دیگرے غور کریں گے کہ ان میں پاکستان میں کون سی چیزیں مہیا ہیں اور کون سی نہیں؟

سرمایہ:۔ پاکستان میں جتنے صوبے ہیں ان میں پنجاب ہی ایک ایسی جگہ ہے۔ جہاں کچھ نہ کچھ سرمایہ موجود ہے۔ صوبہ سرحد، سندھ اور کشمیر تمامتر زراعتی صوبے ہیں، ان کے پاس سرمایہ کہاں باقی رہا۔ بلوچستان، اس کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ ہاں سندھ کے پاس سرمایہ ہے، لیکن وہ ہندوؤں کا ہے۔ پھر پنجاب میں بھی جو سرمایہ ہے اُس کا اکثر حصّہ ہندوؤں کا ہے۔ جیسا کہ

پنجابی صاحب کو خود اقرار ہے :-

"دوسری طرف صنعت وتجارت کے میدان میں، جس میں اکثر روپئے قرض لے کر لگائے جاتے ہیں مسلمانوں کے لئے بہت کم مواقع ہیں، کیونکہ روپئے کا بازار ہندوؤں کے ہاتھوں میں ہے اور وہ مسلمانوں کو اِن کاموں کے لئے روپیہ نہیں دیتے"

"کاروبار، جیسے انشورنس، ٹریڈنگ کمپنیاں، غیر ملکی ایجنسیاں، الیکٹرک سپلائی اور رسل ورسائل کی کمپنیاں تمام ہندوؤں کے ہاتھوں میں ہیں اور وہی انھیں چلاتے ہیں ہندو کاروبار اور کمپنیاں شمالی ومشرقی مسلم حلقے میں بُری طرح چھائی ہوئی ہیں"

(کانفڈریسی آف انڈیا صفحہ ۱۳۰)

اس صورت حال میں جبکہ مسلمانوں کے پاس سرمایہ کی اس قدر قلت ہے، پاکستان میں صنعتوں کی ترقی کس طرح ممکن ہے؟ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان کا ہندو سرمایہ دار سرمایہ لگائے گا۔ لیکن مشرقی پنجاب کے ہندو اضلاع کو خارج کرکے اوّل تو آپ سرمائے کا ایک بڑا حصّہ باہر نکال دیتے ہیں۔ دوسرے اگر ہندو سرمائے سے کام کیا گیا تو اس سے ہندوؤں کو نفع پہنچے گا اور ہندو سرمایہ داری بڑھے گی۔ پھر اس حقیقت کو بھی سامنے رکھنا چاہئے کہ پاکستان میں ایک مضبوط فرقہ دار حکومت بن جانے کے بعد ہر غیر مسلم سرمایہ دار، سرمایہ لگانے میں پس وپیش کرے گا۔ کیونکہ جب تک اسٹیٹ کی مشینری پر اُس کا کوئی ہاتھ نہ ہو، اس کے سرمایہ کو ہر وقت خطرہ لاحق رہے گا۔ کون بے وقوف ہوگا کہ وہ اربوں روپئے لگا کر پاکستان کی صنعت وحرفت کو ترقی دے۔ لیکن پاکستان فیڈریشن کے ایک قانون سے اُس کا سارا کاروبار خاک میں مل جائے اور اس کا سرمایہ ڈوب جائے۔ ایک مضبوط مذہبی فرقہ وار حکومت کے غیر متعین حالات میں، کبھی غیر مسلم سرمایہ دار اپنے سرمائے کو جوکھوں میں نہ ڈالیگا۔ اگر پاکستان فیڈریشن میں ایک قانون بھی ایسا پاس ہوگیا، جس سے ہندو سرمایہ داروں پر اثر پڑے، تو پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندو سرمایہ دار اپنا سرمایہ لگانے سے جھجکے گا۔

دنیا میں سرمایہ دار سب سے پہلے یہ کوشش کرتے ہیں کہ ملک کی حکومت پر اُن کا

قبضہ ہو۔ آج جرمنی، جاپان، امریکہ، انگلینڈ وغیرہ میں سرمایہ داروں ہی کی حکومت ہے۔ جس ملک کی حکومت پر سرمایہ داروں کا اثر و اقتدار نہیں ایسے ملک میں وہ کبھی سرمایہ نہیں لگا سکتے۔ یورپین سرمایہ دار آج ہندستان میں اس تیزی سے انگریزی حکومت ہی کے بل بوتے پر سرمایہ لگا رہے ہیں، جن کے مفاد کی برطانی حکومت بھی نہایت وفاداری سے حفاظت کرتی رہتی ہے۔ اگر پنجاب ہندستان کا ایک جزو ہوگا اور پنجاب کی حکومت میں ہندوؤں کا بھی ہاتھ ہوگا تو وہ یقینی اپنا سرمایہ پنجاب کی صنعتوں کو ترقی دینے میں لگائیں گے۔

بہرحال مسلمانوں کے پاس سرمایہ موجود نہیں، ہندو اپنا سرمایہ جوکھوں میں ڈالنے سے رہے، تو پھر پاکستان میں صنعتی ترقی کے کیا امکانات ہیں؟ یہ قیاس کرنا کہ حکومت ان کاموں میں سرمایہ لگائے گی۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ حکومتیں سرمایہ دیتی نہیں بلکہ مختلف ٹیکسوں کے ذریعہ لیتی ہیں۔ علاوہ ازیں ایک زراعتی ملک کی حکومت کے پاس سرمایہ کہاں سے آئے گا؟ کہ وہ کاروبار میں لگائے۔ صرف زراعتی لگان کی آمدنی سے تو حکومتوں کا خرچ بھی نہیں چلتا۔ اور پاکستان کے غریب کاشتکاروں کی ایسی حالت بھی نہیں کہ ان پر مزید ٹیکس لگا کر ان کا بوجھ بڑھایا جائے۔ کسی قومی حکومت کو تو ان کا بار کم کرنا ہوگا۔ اگر ان پر زیادہ ٹیکس لگایا گیا تو ان میں غربت بڑھے گی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ قوت خرید بھی کم ہوگی۔ حکومتوں کی آمدنی کے ذرائع تو صنعت و تجارت ہی ہیں، زراعت نہیں۔ جس ملک میں انڈسٹری نہ ہو اس کی حکومت تو خود مفلس و قلاش رہے گی۔ ہاں پنجاب کے مسلمان سرمایہ دار، جن کی تعداد بہت کم ہے، سرمایہ لگا سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے خیال میں وہ بھی نہ لگائیں گے، کیونکہ پاکستان کا بازار (MARKET) بہت محدود ہوگا، اور وہاں زیادہ منافع کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ صوبۂ سرحد، سندھ، بلوچستان اور کشمیر کے عوام کا افلاس ضرب المثل ہے۔ ان کی قوتِ خرید بہت ہی کم ہے۔ بس لے دے کے پنجاب، یعنی ایک صوبے کا بازار رہ جاتا ہے۔

یہ سمجھنا کہ یورپین سرمایہ دار، جو اس کام میں بڑے مشتاق ہیں، اپنا سرمایہ لگائیں گے غلط ہے۔ کیونکہ اوّل تو وہ اتنے محدود مارکیٹ میں سرمایہ لگانا پسند نہ کریں گے، دوسرے یہ کہ

موجودہ جنگ سے یورپ پر جو تباہی آئی ہے، اس کا ازالہ کرنے کے لئے کم سے کم ۲۵ برس چاہئیں۔ اس صورت میں یقینی پاکستانیوں کو ۲۵ برس تک انتظار کرنا پڑے گا تاکہ یورپیوں کی حالت سدھرے اور وہ ہندوستان میں سرمایہ لگائیں۔ ایران و افغانستان وغیرہ سے بھی سرمایہ کی اُمید رکھنا غلط ہے۔ کیونکہ اوّل تو اُن کے پاس سرمایہ نہیں اور اگر ہو بھی تو وہ اپنے ملکوں کو، جو سرمایہ کے بغیر اس قدر پسماندہ ہیں، آگے بڑھانے کی کوشش کریں گے یا پاکستان کی فکر کریں گے۔ پاکستان کے پڑوس کے تمام ممالک، سوائے ہندو ہندوستان کے، مفلس وقلاش ہیں۔ غریب افغانستان کے پاس سرمایہ نہ ہونے کے سبب اب تک اس کی ریلوے نہ بن سکی۔ ایران میں بھی تمام ترقیاں سرمایہ نہ ہونے کے سبب رُکی ہوئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان ممالک کی آمدنی اتنی بھی نہیں کہ وہ ایک آزاد حکومت کے اخراجات کا بار برداشت کر سکیں۔ غیر ممالک میں ان کے جو سفراء رہتے ہیں یہ ان کے اخراجات بھی برداشت نہیں کر سکتیں اور انھیں بڑی تنگی ترشی سے گذر کرنی پڑتی ہے۔

یہ توقع بھی نہ رکھنی چاہئے کہ ہندو ہندستان کے سرمایہ دار، پاکستان میں سرمایہ لگائیں گے۔ جس ملک کی حکومت پر ان کا قابو نہیں وہاں وہ اپنے سرمائے کو خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔ جس طرح ایک فرقہ دار ہندو حکومت کے تحت جس میں مسلمانوں کا کوئی اقتدار نہ ہو، ایک مسلمان اپنے سرمائے کو جوکھوں میں نہیں ڈال سکتا۔

غرضیکہ جہاں تک سرمائے کا تعلق ہے، پاکستان میں صنعتی ترقی کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔

خام اشیاء:۔ انڈسٹری کے لئے دوسری اہم چیز خام پیداوار ہے۔ خام پیداوار میں سب سے اہم عنصر لوہا اور کوئلہ ہے۔ اس کے بعد روئی، جوٹ، تلہن، آدکھ، پٹرولیم وغیرہ چیزیں اہمیت رکھتی ہیں۔ پاکستان میں معدنیات کی پیداوار کی کیفیت ذیل کے اعداد سے معلوم ہوگی:۔

پاکستان میں معدنیات کی کمی

۱۹۳۶ء کے اعداد - سالانہ پیداوار

	معدنیات	پاکستان میں	ہندستان میں
۱	کوئلہ	۱ لاکھ ۵۶ ہزار ٹن	۲ کرور ۲۵ لاکھ ٹن
۲	لوہا	-	۲۵ لاکھ ٹن
۳	پیٹرولیم	۴۳ لاکھ گیلن	۳۳ کرور ۸ لاکھ گیلن
۴	ابرک	.	۸۶ ہزار ہنڈرڈویٹ
۵	مینگنیز	.	۶ لاکھ ۲۴ ہزار ٹن
۶	چاندی	.	۶۰ لاکھ ۴ ہزار آونس
۷	سونا	۴۳ آونس	۳ لاکھ ۸۱ ہزار آونس

پنجاب کے سوا پاکستان کے دوسرے علاقے تو بالکل گئے گذرے ہیں۔ جو کچھ زرخیز اور معدنی علاقے ہیں وہ پنجاب اور کچھ کشمیر میں ہیں۔ پاکستان، معدنیات میں کتنا غریب ہے، یہ مندرجہ بالا چارٹ سے معلوم ہو جاتا ہے۔ اگر کچھ لوہا نکلتا بھی ہے تو کوئلہ موجود نہ ہونے کے سبب اسے گلایا نہیں جا سکتا۔ غرضیکہ بڑے پیمانے پر کچا مال حاصل کرنے کے لئے پاکستان کو دوسرے ممالک کا محتاج ہونا پڑے گا۔ ممکن ہے کہ برسوں کی چھان بین کے بعد پاکستان میں معدنیات کے مزید ذخیرے دریافت ہو سکیں۔ لیکن اوّل تو اس کے لئے بہت زیادہ وقت درکار ہے، دوسرے ان خام پیداوار کو ترقی دینے کے لئے بھی بڑے سرمائے کی ضرورت ہے، جو پاکستان کے پاس نہیں۔ افغانستان معدنیات سے بھرا ہوا ہے لیکن اس کے پاس اتنا سرمایہ نہیں کہ وہ اپنی پوشیدہ دولت کو بڑے پیمانے پر باہر نکال سکے۔ خود ہندستان میں کتنی معدنی دولت دبی پڑی ہے، لیکن فی الحال ہندستان کے پاس اتنا سرمایہ نہیں کہ وہ ملک کے چپّے چپّے کا جائزہ لے، اور اس کی دبی ہوئی دولت کو استعمال کرے۔

خام اشیاء کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے اور یہ اقرار کرتے ہوئے کہ پنجاب میں خام پیداوار کی کمی ہے۔ پنجابی صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"لوگوں کو یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ دنیا میں بہت کم صنعتی ممالک ایسے ہیں جو بعض معدنیات کے لئے کسی دوسرے ملک کے محتاج نہ ہوں۔ سندھ[1] اپنی پڑوسی مسلم سلطنتوں سے ایک قدرتی مشابہت رکھتا ہے اور جن معدنیات کی اسے ضرورت ہے، وہ ان مقامات سے درآمد کر سکتا ہے۔ مثلاً افغانستان ہمارا قریبی پڑوسی ہے اور کانوں سے بھرا پڑا ہے۔ معدنیات کی رسد کے لئے اس سے ہمارا معاہدہ ہو سکتا ہے۔"

(کانفڈریسی آف انڈیا۔ صفحہ ۲۲۲)

اس تحریر کے اوپر کے پیراگراف میں آپ نے پاکستان کا جاپان سے بھی مقابلہ کیا ہے :۔

"اگر جاپان، ایک لاکھ ۴۷ ہزار مربع میل کا رقبہ اور پاکستان کے مقابلہ میں ½ حصہ قابل زراعت اراضی رکھتے ہوئے اور معدنیات کی عدم موجودگی کے باوجود، ایک طاقتور صنعتی ملک کے درجے تک پہنچ سکتا ہے تو یقینی پاکستان ۴ لاکھ ۰۵ ہزار مربع میل کی وسعت اور وسیع اقتصادی ذرائع رکھتے ہوئے، اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکتا ہے اور دنیا کے بازار میں مقابلہ کر سکتا ہے۔"

(" ۔ صفحہ ۲۲۲)

یہ تحریر "دی نیو ٹائمز لاہور مورخہ ۲۷ نومبر ۱۹۳۸ء" سے پنجابی صاحب نے اپنے استدلال کے ثبوت میں نقل کی ہے۔

ہمارے پاکستانی بھائی اکثر بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ جذبات کا ان پر اس قدر غلبہ ہو جاتا ہے کہ انھیں دنیا کی حقیقتیں نظر ہی نہیں آتیں۔ جوشِ عقیدت میں آپ پاکستان کا مقابلہ ایشیا کے سب سے بڑے سامراج، جاپان سے کر بیٹھے۔ خیریت ہوئی کہ آپ نے پاکستان کا مقابلہ فرانس یا انگلستان سے نہ کر دیا۔ کیونکہ فرانس کا رقبہ صرف ۲ لاکھ ۱۳ ہزار مربع میل ہے۔ اور یہ پاکستان کے نصف کے برابر بھی نہیں۔ پاکستان کے مقابلے میں انگلستان تو اور بھی گیا گذرا ہے، کیونکہ اس کا رقبہ تو صرف ۹۰ ہزار مربع میل ہے، اور پاکستان سے ¼ سے بھی کم ہے۔ جہاں تک معدنیات

[1] یعنی سندھستان

کا تعلق ہے، اس کے لئے صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ جمشید پور کا ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل ورکس، برطانی شہنشاہیت کے اندر سب سے بڑا لوہے کا کارخانہ ہے۔ اور لوہے کی ڈھلائی اتنے بڑے پیمانے پر انگلستان کیا برٹش سامراج میں کہیں نہیں ہوتی۔ لیکن وہ نہ صرف صنعت وحرفت میں ہندستان سے سینکڑوں درجے بڑھا ہوا ہے، بلکہ ہندستان اور پاکستان پر اس نے حکومت بھی جما رکھی ہے۔

ہمارے بھائی یہ بھول گئے کہ اگر جاپان کے پاس اپنے ملک میں معدنیات کافی نہیں، تو اس کے قبضے میں ایسی نوآبادیات ہیں جن سے وہ کچا مال حاصل کرتا ہے۔ دنیا کے تمام صنعتی ممالک کے پاس اس طرح کی نوآبادیاں موجود ہیں، اور وہ ان پر قبضہ کرنے کے لئے برسرپیکار رہتی ہیں۔ دنیا میں گذشتہ ایک سو سال سے قوموں کے درمیان جس قدر جنگیں ہوئی ہیں ان کا مقصد دو۲ لفظوں میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ کچّا مال اور بازار (MARKET) جس ملک کے پاس یہ دو۲ چیزیں نہیں وہ ترقی نہیں کرسکتا۔ یورپین ممالک نے جو بے پناہ ترقی کی ہے، اس کا سبب یہی ہے کہ ان کے قبضے میں ایسے ممالک آگئے جو ان کے لئے کچّا مال مہیّا کریں اور بازار کا کام دیں۔ جن ملکوں کے پاس نوآبادیاں نہیں اُن کی انڈسٹری گھٹ گھٹ کر مر رہی ہے اور شب و روز ان کی یہی کوشش ہے کہ کسی طرح نوآبادیاں ان کے ہاتھ لگیں۔ ہٹلر کی موجودہ جنگ بھی اسی لئے ہے۔ جرمن مصنوعات کیلئے کچے مال اور بازار کا فقدان ہے۔ جرمنی کی عظیم الشان لوہے کی انڈسٹری کی وسعت کے لئے لوہا، کوئلہ اور بازار کی ضرورت ہے۔ ہٹلر کے پیچھے جو اصل طاقت ہے وہ جرمن فوج کی نہیں بلکہ رُور (RUHR) کے کارخانہ داروں کی ہے، جو اپنی بھاری صنعتوں (HEAVY INDUSTRIES) کو آگے بڑھانے کے لئے دنیا کے بازار پر چھاپہ مارنا چاہتے ہیں۔ غالباً ناظرین کو علم ہوگا کہ ہٹلر کو برسرِ اقتدار لانے میں سب سے بڑا ہاتھ اسٹینس (STINNES) کے سیاسی وارث تھائسن (THYSSEN) کا تھا، جس کا جرمن اسٹیل ٹرسٹ (GELSENKIRCHENER BERGWERKS-A(G) میں ۱۰ فی صدی حصّہ ہے۔ غرضیکہ موجودہ سیاست کوئلے اور لوہے کی بین الاقوامی سیاست ہے۔

ناروے میں جرمنی اور برطانیہ میں جو زبردست جنگ ہوئی، اُس کا سبب صرف یہ تھا کہ

نارووک، سویڈن کے کچے لوہے کی برآمد کا بہت بڑا بندرگاہ تھا۔ فرانس سے ہٹلر کی جنگ کا راز بھی یہی ہے کہ وہ لورین (LORRAINE) کی لوہے کی کانوں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ جیسا کہ فرانس اور جرمنی کی شرائطِ مصالحت سے بھی ظاہر ہے۔ نہ صرف موجودہ جنگ بلکہ گذشتہ جنگِ عظیم میں بھی قیصر کا فرانس سے یہی مطالبہ تھا کہ وہ لورین اس کے حوالے کر دے۔

غرضیکہ کچا مال یا بازار ایسی چیزیں نہیں کہ مانگے تانگے سے مہیا ہو سکیں، اور اس کے بل پر کوئی ملک صنعتی بنایا جا سکے۔ اگر جاپان کے پاس اپنا کچا مال نہیں تو نوآبادیوں سے مل سکتا ہے۔ لیکن پاکستان کے پاس کون سی نوآبادی ہے؟ افغانستان سے کچا مال حاصل کرنے کی توقع فضول ہے۔ کیونکہ اول تو اُسے اس کی خود ضرورت ہے، دوسرے یہ کہ کسی غیر ملک کے بل بوتے پر کارخانے نہیں چلائے جا سکتے۔ کس ملک کا کب کیا رویہ ہو، یہ قطعاً نہیں کہا جا سکتا۔ پھر دوسرے ملک سے کچا مال لینے میں چنگی ادا کرنی پڑتی ہے، اور چنگی ادا کرنے کے بعد مال گراں پڑتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی صنعتیں دوسرے ممالک کی صنعتوں سے مقابلہ نہیں کر پاتیں۔

لیکن پاکستان کے برخلاف ہندستان میں کچا مال کی اس قدر بہتات ہے کہ دنیا کا کوئی ملک شائد ہی اِس کا مقابلہ کر سکتا ہو۔ پھر ساتھ ہی ساتھ ۲۸ کرور آبادی (پاکستان کے ماسوا) کا ایک عظیم الشان بازار بھی موجود ہے۔ پاکستان کی صنعتوں کا مقابلہ اکثر ہندستان ہی کی صنعتوں سے پڑے گا اور پاکستانی صنعتیں یقینی اس کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکیں گی۔ صنعت کا تو اُصول ہے کہ مال کی تیاری پر جتنی کم لاگت آئے اور چیزیں جس قدر زیادہ تعداد میں تیار ہوں، اُسی تناسب سے اس کی قیمت بھی کم ہوگی، لیکن غریب پاکستان کو تو تیاری پر دام بھی زیادہ خرچ کرنے پڑیں گے اور اپنی قلیل آبادی کے تناسب سے چیزوں کی پیداوار کی مقدار اور تعداد بھی کم رکھنی پڑے گی۔

مشینری کسی ملک کی صنعتی ترقی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مشینری اور دوسرے آلاتِ پیداوار جو اُسے درکار ہوں وہ خود بنائے۔ غیر ممالک سے مشینریاں خریدنے میں اوّل تو ملک کی دولت کا ایک بڑا حصّہ باہر نکل جاتا ہے۔ دوسرے

گراں مشینیں خریدنے میں مال کی تیاری پر لاگت زیادہ بیٹھتی ہے، جس سے مال کی نکاسی پر اثر پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں بیرونِ ملک سے مشینری منگانے میں چنگی بھی ادا کرنی پڑتی ہے، جس سے وہ اور گراں پڑتی ہیں۔ اور مشینری پر چنگی کی جو گراں شرح ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ موجودہ جنگ کے زمانے میں تو مشینری پر ہندستانی بندرگاہوں میں تقریباً ۵۰ فی صدی چنگی ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ چنگی کی آمدنی سے ملکی حکومت کو فائدہ ہوگا اور ملک کے سوشل اور تعمیری (NATION-BUILDING) کام زیادہ آگے بڑھیں گے، لیکن یہ چنگی انڈسٹری پر تو اثر انداز ہو کے رہے گی۔

چھوٹے چھوٹے ملکوں میں مشینری تیار کرنا نہ صرف مشکل بلکہ محال بھی ہے۔ مشینریاں صرف ان ہی ملکوں میں ڈھالی جاسکتی ہیں جو اعلیٰ درجے کے صنعتی ملک ہوں، اور ان میں خود مشینری کی کھپت کا اچھا بازار ہو۔ مثال کے طور پر ایک اونچے پاور کے الیکٹرک ڈائنمو کو لے لیجئے۔ ڈائنمو سو دو سو ڈھالنے میں تو اس کا خرچ بھی نہ نکلے گا بلکہ سخت خسارہ ہوگا۔ ہاں اگر پانچ دس ہزار ڈائنمو ڈھالے جائیں گے تب کہیں فائدہ ہوگا۔ لیکن جس ملک کے پاس دس ہزار ڈائنمو کا بازار نہیں وہ کیوں اس چکر میں پڑے گا۔ اِسی طرح سمینٹ وغیرہ ڈھالنے کی مشینیں ہیں جن کے پُرزے ہندستان میں مشکل سے ملتے ہیں۔ اگرچہ ہندستان صنعت و حرفت میں کافی آگے بڑھ گیا ہے لیکن یہ ابھی اس قابل نہیں ہوا کہ اپنی مشینیں آپ ڈھال سکے۔ مشینری کے معاملے میں وہ یورپ اور امریکہ کا محتاج ہے۔ جب ہندستان جیسے عظیم الشان ملک کی یہ حالت ہے تو پاکستان کا کیا ذکر؟

مشینری ڈھالنے سے پہلے اس کی نکاسی کے لئے بازار کی ضرورت ہے۔ اور مشینریوں کی نکاسی کے لئے لازمی ہے کہ ملک صنعت و حرفت میں کافی آگے بڑھا ہوا ہو۔ صنعت و حرفت میں وہی ملک آگے بڑھ سکتا ہے، جس کے پاس کچا مال اور بازار ہو۔ غرضیکہ یہ سائیکل کا چکر ہے، اور ایک چیز کا دوسرے پر انحصار ہے۔ دنیا میں بہت کم ملک ایسے ہیں جو

مشینریاں ڈھال سکتے ہیں۔ امریکہ، جرمنی، انگلینڈ، فرانس اور جاپان کے سوا بڑے پیمانے پر مشینیں ڈھالنے کا کام دنیا میں کہیں نہیں ہوتا۔ بلکہ اعلیٰ درجے کی مشینیں تو ایک ہی دو ملک میں ڈھلتی ہیں جیسے رالس رائس (ROLLS ROYCE) ٹائپ کا ایروپلین کا انجن صرف امریکہ میں ڈھل سکتا ہے اور وہ بھی فورڈ کے کارخانے میں۔ انگلینڈ نے اس طرح کا انجن ڈھالنے کی بہتیری کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ حال میں جنگی ضرورتوں کے لئے جب انگلستان نے ہنری فورڈ کو رالس رائس کے ایروپلین کے لئے آرڈر دیا تو فورڈ صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ انگلستان منہ تکتا رہ گیا لیکن یہ نہ ہو سکا کہ انگلستان خود ایسے انجن تیار کرلے۔ جرمنی کے اعلیٰ ساخت کے ٹینکوں نے موجودہ جنگ میں جو کام کیا ہے وہ ہر شخص کو معلوم ہے۔ غرض یہ ہے کہ مشینری کی ڈھلائی صنعتی ترقی کی معراج ہے۔ اور یہ کام وہی ممالک کر سکتے ہیں جو صنعت و حرفت میں بہت زیادہ آگے بڑھے ہوئے ہوں، ان کے پاس اعلیٰ درجے کی کاریگری (SKILL) ہو، اور نہایت عمدہ قسم کا لوہا ہو۔ ہندستان کے متعلق تو یہ توقع بھی کی جا سکتی ہے کہ وہ دس بیس سال کے بعد اپنی مشینیں آپ ڈھالنے کے لائق ہو جائے گا لیکن پاکستان سے تو کبھی یہ توقع نہیں قائم کی جا سکتی۔

کاریگری

صنعتی کاریگری اور ہنرمندی بھی اُسی ملک کا حصہ ہے جو انڈسٹری میں بہت آگے بڑھا ہوا ہو۔ جس ملک کی حکومت اپنے نوجوانوں کو سائنس کی تعلیم دینے پر اربوں روپئے خرچ کرتی ہے، اور کروروں روپئے سالانہ ایک ایک شعبے کے سائنٹفک ریسرچ پر صرف کرتی ہے، اُسی ملک میں کاریگری اور ہنرمندی بھی ترقی کر سکتی ہے۔ ہندستان تو ابھی عام تعلیم ہی میں پیچھے ہے، سائنٹفک تعلیم کا کیا ذکر۔ یہی سبب ہے کہ ہمیں ٹاٹا میں لوہا ڈھالنے یا ڈالمیا نگر میں سمنٹ بنانے کے لئے جرمن انجنیر رکھنے پڑتے ہیں، اور تقریباً تمام کارخانوں میں مینیجر اور فورمین وغیرہ یورپین ہوتے ہیں۔ بہار (پٹنہ) میں ایک سائیکل کا کارخانہ کھلنے والا ہے۔ لیکن سائیکل کے پرزے ڈھالنے کے لئے ہندستان میں کاریگر موجود نہیں، چیکوسلوواکیا سے انجنیر آئے ہیں۔

غیر ملکی کاریگروں کی خدمات حاصل کرنے میں بہت زیادہ صرفہ اور کئی قسم کے الاؤنس دینے پڑتے ہیں، جس سے مال کی تیاری پر لاگت کا تناسب بڑھ جاتا ہے۔ ہندستان اگر اسی رفتار سے صنعت میں آگے بڑھتا رہا تو بہت جلد یہ سائنٹیفک تعلیم پر کافی رقم صرف کرنے لگے گا اور اچھے کاریگر بڑی تعداد میں پیدا ہوں گے۔ لیکن پاکستان میں اس کی دور کی بھی توقع نہیں کی جا سکتی۔

علاوہ اس کے ہندستان میں فی الحال جس قدر کاریگری اور ہنرمندی موجود بھی ہے، پاکستان اس سے سینکڑوں میل کے فاصلے پر ہے۔ تعلیم یافتہ اور ہنرمند مزدور، کلکتہ، بمبئی، احمد آباد، جمشید پور اور کچھ کانپور میں دستیاب ہوتے ہیں۔ لیکن پاکستان میں ایک بھی ایسا صنعتی مرکز موجود نہیں، جہاں سے اسے ہنرمند مزدور (SKILLED LABOUR) مل سکیں۔

بازار

صنعتی ترقی کے سلسلہ میں بازار (MARKET) کی ضرورت واہمیت پر کچھ روشنی پڑ چکی ہے یہاں اس امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان سے علٰحدگی کے بعد پاکستان کی مصنوعات کا بازار بہت ہی محدود رہ جائیگا۔ پاکستان کی مجموعی آبادی تقریباً ۲½ کروڑ ہوگی انیں صوبۂ سندھ، بلوچستان، سرحد، اور کشمیر کے عوام کی قوت خرید بہت کم ہے کیونکہ انہیں انتہائی درجے کا افلاس ہے۔ یوں تو سارے ہندوستان کے عوام غریب ہیں لیکن ان صوبوں کے عوام کی غربت ہندستانیوں سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ان صوبوں میں پاکستانی مصنوعات کے لئے بازار نہیں مل سکتا۔ بس ایک پنجاب کا صوبہ ہے جہاں نسبتاً اچھا بازار مل سکتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ صرف ایک صوبے کے بازار کے بل بوتے پر کوئی صنعت ترقی نہیں کر سکتی۔ ہندستان کی مصنوعات گیارہ صوبے اور چھ سو ریاستوں کا عظیم الشان بازار رکھنے کے باوجود، عوام کی قوت خرید کم ہونے کے سبب، خاطر خواہ ترقی نہیں کر پاتیں۔

انڈسٹری کا تو یہ کلیہ ہے کہ جتنے بڑے پیمانے پر پیداوار (LARGE-SCALE PRODUCTION) ہو گی اتنا ہی زیادہ منافع ہوگا، اور چیزیں سستی پڑیں گی۔ ہندستان میں کچا مال، سرمایہ، اور کاریگروں کی فراوانی اور سب سے بڑھ کر ایک عظیم الشّان بازار حاصل ہونے کے سبب چیزیں عمدہ اور سستی ہوں گی۔ لیکن برعکس اس کے پاکستان میں خود اپنا سرمایہ، کچا مال، کاریگر اور وسیع بازار حاصل نہ ہونے کے سبب اس کی مصنوعات ہندستانی مصنوعات سے گراں پڑیں گی۔ پاکستان کی مصنوعات کا ہندستان کی مصنوعات سے مقابلہ کرنا مشکل ہو جائے گا اور وہ یقینی اس کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکیں گی۔

اتنا ہی نہیں ہمیں تو یہ بھی ڈر ہے کہ کہیں پاکستان کی رہی سہی انڈسٹری بھی نہ چوپٹ ہو جائے۔ اس وقت لودھیانہ کے اونی کپڑے، ٹوپیاں، کمل، ہوزری وغیرہ سیالکوٹ کے اسپورٹ کے سامان اور کشمیر کے شال وغیرہ سارے ہندستان کے بازاروں میں بکتے ہیں۔ لیکن تقسیم کے بعد دو ملک ہو جانے پر یہ صورت نہ رہے گی۔ اِن اشیاء پر ہندستان میں داخلے کے وقت چنگی لگے گی، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندستان کا مارکیٹ ان کے لئے بند ہو جائے گا۔ پاکستان کی تجارتی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے پنجابی صاحب لکھتے ہیں :-

> "علیحدگی کے بعد یقینی ہمارے تجارتی حلقے میں ریل اور سڑکوں کے ذریعے ہندستانی مصنوعات کی بھرمار ہوتی رہے گی۔ لیکن ہم انھیں بغیر چنگی ادا کئے ہوئے (پاکستانی) سرحد کے اندر داخل ہونے نہ دیں گے اور یہ چنگی ہماری مرکزی آمدنی کا ایک مزید ذریعہ ہوگی۔"
>
> ("سپریشن" - مصنفہ پنجابی صفحہ ۳۲)

بیشک پاکستانی حکومت کو چنگی عائد کرنے کا حق حاصل ہوگا، لیکن غور فرمائیے کہ اس سے نقصان کس کا ہوگا۔ اگر آپ ہندستانی مصنوعات کیلئے پاکستان کا بازار بند کر دیتے ہیں تو اس سے ہندستان کا زیادہ نقصان نہ ہوگا۔ کیونکہ پاکستان کا بازار بہت

چھوٹا بازار ہوگا اور اس کے بند ہو جانے سے ہندستانی مصنوعات کو زیادہ نقصان نہ پہونچ سکے گا۔ لیکن اس کے برعکس پاکستانی مصنوعات کیلئے ہندستان کا بازار بند ہو جانا تو گویا اس کی موت ہی ہو جائیگی۔

ان موانع و مشکلات کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہندستان سے علیٰحدگی کے بعد پاکستان کی صنعتی ترقی کے امکانات بہت کم ہیں، اور چونکہ موجودہ زمانہ میں صنعتی ترقی ہی پر ملک کی مجموعی ترقی کا دار و مدار ہے، لہذا ہمیں پاکستان کا مستقبل نہایت ہی تاریک نظر آتا ہے۔ دنیا کے چھوٹے چھوٹے صنعتی ممالک آج اس فکر میں ہیں کہ کس طرح وہ بڑے ملکوں سے ناتہ جوڑیں اور وہ کسی بڑی وحدت (BIGGER UNIT) کے جزو ہو جائیں تاکہ انھیں بین الاقوامی تجارتی معاہدوں میں زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل ہوسکیں بڑے بڑے معاہدوں میں چھوٹے اجزار کو کون پوچھتا ہے۔ فن لینڈ، اسٹونیا، لٹویا وغیرہ کی کوئی بات بھی نہیں پوچھتا۔ لیکن ہندستان، بین الاقوامی تجارت میں اپنی ایک جگہ رکھتا ہے اور اس کے ساتھ رہ کر بڑے بڑے تجارتی فوائد اور مراعات حاصل ہوسکتی ہیں۔ موجودہ دَور، تجارتی یکجہتی اور اشتراک (CO-OPERATION) کا دور ہے۔ ہر ملک دوسرے ملک سے تجارتی تعلقات کا متمنی ہے۔ لیکن یہاں پاکستانی بھائیوں کو جو چیز حاصل ہے، وہ نادانی سے اُسے بھی ٹھکرا دینا چاہتے ہیں۔

۲- پاکستان کی مالیات

تحریک پاکستان کی سب سے بڑی کمزوری شمالی و مغربی مسلم صوبوں کی مالی بدحالی ہے۔ پاکستان کے چاروں صوبوں (پنجاب، سندھ، سرحد و بلوچستان) میں سندھ اور صوبہ سرحد تو ایسے صوبے ہیں، جو اپنی صوبائی حکومت کے اخراجات بھی برداشت نہیں کرسکتے، اور انھیں اپنا کاروبارِ حکومت چلانے کیلئے مرکزی حکومت کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے۔ حکومتِ ہند سندھ کو ایک کرور پانچ لاکھ روپئے اور صوبہ سرحد کو ایک کرور روپئے سالانہ بطور امداد دیتی ہے۔ سندھ جیسے بڑے صوبے کا اتنے زمانے تک بمبئی کے ساتھ ملحق رہنے کا سبب اس کی مالی کمزوری کے سوا کچھ نہ تھا۔ چنانچہ علیحدگیٔ سندھ کے خلاف سب سے بڑی دلیل یہی تھی کہ وہ علیحدہ صوبہ بننے کے بعد اپنے اخراجات برداشت نہیں کرسکتا۔ شمالی و مشرقی صوبے کو اصلاحات دینے کے خلاف بھی یہی دلیل پیش کی جاتی تھی کہ ایک جمہوری حکومت کے اخراجات اس کیلئے ناقابلِ برداشت ہیں۔

صوبہ بلوچستان کی حالت بھی ان صوبوں سے کچھ بہتر نہیں، بلکہ اور بھی بدتر ہے۔ سندھ اور سرحد تو اپنے اخراجات کے ایک بڑے حصّے کی کفالت کر بھی لیتے ہیں، لیکن بلوچستان کے متعلق اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اس کے نظم ونسق کی کفالت تمامتر حکومتِ ہند ہی کے ذمّے ہے۔ بلوچستان کے انتہائی افلاس کی کیفیت اسی امر سے معلوم ہوجاتی ہے کہ اس سارے صوبے کی انکم ٹیکس کی مد کی آمدنی صرف ۲ لاکھ ۹ ہزار روپیہ ہے (انکم ٹیکس سے پنجاب کی آمدنی ۸۷ لاکھ ۸۰ ہزار ہے)۔

غرضیکہ پاکستان کے چاروں صوبوں میں، تین صوبوں کی یہ کیفیت ہے۔ ظاہر ہے کہ جو صوبے اپنی حکومت کا خرچ بھی پورا نہیں کرسکتے۔ ان میں تعلیم اور دوسرے ترقی کے صیغوں پر کہاں تک خرچ کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ان علاقوں کے باشندے تعلیم وغیرہ میں بہت زیادہ پیچھے ہیں۔ بلوچستان کا کیا ذکر صوبہ سرحد اور سندھ میں بھی اب تک

ایک یونیورسٹی نہ قائم ہو سکی۔

غرضیکہ پاکستان کے صوبوں میں پنجاب ہی ایک ایسا صوبہ ہے جس کی مالی حالت تشفی بخش ہے۔ اِس کی آمدنی تقریباً گیارہ کرور سالانہ ہے۔ یہ رقم تمام کی تمام صوبے کی حکومت پر صرف ہو جاتی ہے اور تعلیم وغیرہ پر صرف کرنے کیلئے بہت تھوڑی سی رقم بچ رہتی ہے۔ بجٹ ۱۹۳۸-۳۹ء میں ۱۰ کرور ۹۰ لاکھ روپئے کی آمدنی ہوئی اور ۱۰ کرور ۸۸ لاکھ روپئے خرچ ہوئے۔ پنجاب کی مالی حالت کا اِسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ متذکرہ مالی سال میں تعلیم کیلئے صرف ۲۱ لاکھ اور ڈولپمنٹ (DEVELOPMENT) کیلئے صرف ۲۵ لاکھ کی معمولی رقمیں نکالی گئیں، حالانکہ بہار جیسے چھوٹے صوبے کی حکومت تعلیم پر تقریباً ڈیڑھ کرور روپئے سالانہ صرف کرتی ہے۔

بہرحال مقصد یہ ہے کہ مالی اعتبار سے پنجاب کی بھی ایسی حالت نہیں ہے کہ اسے آسودہ حال کہا جاسکے۔ ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ پنجاب اپنے پیروں پر کھڑا ہے، اور اپنے انتظامی اخراجات کیلئے مرکز کا دست نگر نہیں۔ لیکن تعمیری کاموں کیلئے اس کے پاس بھی خاطر خواہ رقم نہیں بچتی۔ حامیان پاکستان کا مقصد صرف حکومت چلانا نہیں ہو سکتا، بلکہ ان کے سامنے تو نئے سرے سے قومی تعمیر کا مقصد ہے۔ جو اس قلیل آمدنی کے ذریعہ قطعاً ناممکن ہے۔

فیڈریشن کے اخراجات

لیکن سوال یہ ہے کہ علحدگی کے بعد ان صوبوں کا خسارہ کون پورا کرے گا اور سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد کی دیوالیہ حکومتوں کے چلانے کا بار کون اپنے سر لے گا۔ سندھ، بلوچستان، صوبہ سرحد اور پنجاب کی مجموعی آمدنی ۱۶ یا ۱۷ کرور ہے۔ اگر اس میں کشمیر، بہاول پور اور پاکستان کی دوسری ریاستوں کا خراج، جو یقینی اِن ریاستوں کو ادا کرنا پڑے گا، شامل کر لیا جائے تو پاکستان کی آمدنی میں تقریباً ایک کرور روپیہ کا مزید اضافہ ہو جائیگا، لیکن پنجاب کے بارہ غیر مسلم اضلاع نکل جانے کے بعد تقریباً چار کرور کی کمی بھی واقع ہو جائے گی۔ لہذا پاکستان کی مجموعی آمدنی کسی طرح ۱۶، ۱۷ کرور سے نہیں بڑھ سکتی۔

جب یہ ۱۶ - ۱۷ کرور کی رقم ان چار صوبوں کی حکومتیں چلانے ہی کیلئے کافی نہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فیڈریشن کیلئے کثیر مصارف کہاں سے آئیں گے۔ مجوزہ پاکستان نے اس کا یہ حل نکالا ہے کہ پاکستان کے چار صوبوں سے حکومتِ ہند کو جو مرکزی صیغجات جیسے چنگی، نمک وغیرہ سے تقریباً ۲۴ کرور سالانہ کی آمدنی ہوتی ہے، وہ علیحدگی کے بعد پاکستان کو مل جائیگی۔ اور یہ رقم پاکستان کی مرکزی حکومت کے مصارف کیلئے کافی ہوگی۔

ان دنوں مرکزی صیغجات سے حکومتِ ہند کو ان چار صوبوں سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ ۲۳ - ۲۴ کرور سالانہ ہے۔ سنہ ۱۹۳۵-۳۶ء میں ۲۴ کرور ۵۲ لاکھ روپئے مرکزی حکومت کو ان مسلم صوبوں سے ملے، جس میں بڑی بڑی مدیں کراچی بندر کی چنگی (۱۳ کرور روپیہ) نمک کا ٹیکس (۳ کرور) این - ڈبلو - ریلوے (ساڑھے چار کرور)، انکم ٹیکس (سوا کرور) اور پوسٹ و ٹیلیگراف (۲ کرور) وغیرہ ہیں۔

چُنگی

حکومتِ ہند کو مرکزی صیغوں کے ذریعہ ان چار صوبوں سے جو آمدنی ہوتی ہے، اس میں سب سے بڑی رقم کراچی بندر کی چنگی کی ہے۔ مگر اس رقم میں چڑھاؤ اتار بھی ہوتا رہتا ہے۔ جیسے سنہ ۱۹۳۵-۳۶ء کے مالی سال میں کراچی بندر سے ۱۳ کرور ۵۰ لاکھ روپئے بطور چنگی وصول کئے گئے، لیکن سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں یہ رقم گھٹ کر دس کرور ۱۶ لاکھ ہوگئی۔ بہرحال ۱۰ کرور یا ۱۳ کرور جتنی بھی رقم ہو، یہ قطعاً نہیں کہا جا سکتا کہ علیحدگی کے بعد یہ آمدنی علی حالہ قائم رہے گی۔ کیونکہ موجودہ صورت میں شمالی ہند کا جو مال کراچی کے بندرگاہ سے آتا ہے وہ رُک جائے گا، اور کراچی میں وہی مال اُترے گا جو پاکستان کے لئے مخصوص ہوگا۔ شمالی ہند کے اکثر تاجر اپنی آسانی کیلئے کراچی بندر کو بمبئی پر ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ کراچی بمبئی کے بہ نسبت یورپ کے ملکوں سے (عدن سے کراچی ۱۴۷۰ میل ہے اور عدن سے بمبئی ۱۶۶۵ میل) قریب تر ہے۔ لیکن علیحدگی کی صورت میں راجپوتانہ، دہلی اور یوپی وغیرہ کے ہندو صوبے، کراچی سے اپنا مال نہ منگائیں گے، کیونکہ ایسا کرنے میں نہیں،

دوبار چنگی ادا کرنی پڑے گی۔ کراچی میں پاکستانی حکومت کو، اور ہندستان میں داخلے کے وقت ہندستانی حکومت کو۔

لہذا اس رقم میں بھاری تخفیف ہونا یقینی ہے۔ لیکن 'پنجابی' صاحب اس سلسلے میں بہت زیادہ پُر امید نظر آتے ہیں، آپ کا خیال ہے کہ علیحدگی کے بعد پاکستان کی چنگی کی آمدنی گھٹنے کے عوض بڑھے گی۔ آپ لکھتے ہیں:-

"علیحدگی کے بعد، مقامی صنعتوں کی عدم موجودگی کے سبب ہمارے صوبے بدیسی برآمد کو بہت زیادہ بڑھاویں گے، جس سے کراچی کی چنگی کی آمدنی میں مزید اضافہ ہوگا اور اوائل میں ہمیں اس سے کافی مدد ملے گی۔"

(سپریشن، مصنفہ 'ایک پنجابی'، صفحہ ۱۳۱)

یہ کہنا کہ چنگی کی آمدنی میں مزید اضافہ ہوگا، خود پاکستان کے مفاد کو قربان کرنا ہے۔ کیونکہ جیسے جیسے ملک کی برآمد بڑھے گی اسی تناسب سے عوام کی غربت بھی بڑھتی جائے گی۔ آپ بدیسی مال سے چند کروڑ کی چنگی لے کر تو اپنا جی خوش کر لیں گے، لیکن اربوں کی رقم پاکستان سے بدیسی ملکوں کو چلی جائے گی۔ غیر ملکوں سے پانچ کروڑ روپیہ چنگی وصول کرنے کے لئے پاکستان کو ان کا ایک سو کروڑ کا مال خریدنا پڑے گا۔ اور اتنی بڑی رقم ملک سے نکل جائے گی۔ ظاہر ہے جب بدیسی مصنوعات کی، چنگی کی لالچ میں، اس طرح ہمت افزائی کی جائے گی تو پھر پاکستان میں صنعتی ترقی کے کیا امکانات ہیں؟ لہذا یا تو آپ چنگی کی آمدنی بڑھائیں یا صنعت و حرفت کو ترقی دیں۔ یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ نہیں چل سکتیں۔ غرضیکہ اگر پاکستان کے فلاح و بہبود کو مدِ نظر رکھ کر دیکھا جائے تو کراچی کی چنگی میں تخفیف ہونے کا قرینہ ہے، بڑھنے کا نہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت مرکزی حکومت کو سندھستانی صوبوں سے تقریباً تین کروڑ روپیہ سالانہ نمک کے محصول سے آمدنی ہوتی ہے۔ لیکن یہ غیر منصفانہ

ٹیکس کوئی مہذب قومی حکومت اپنے عوام پر عائد نہیں کر سکتی۔ انسانی ضرورت کی اور کھانے پینے کی چیزوں پر محصول عائد کرنا ایک بدیسی سامراجی حکومت کیلئے تو جائز ہو سکتا لیکن یہ بہیمانہ ٹیکس کسی قومی حکومت کے شایانِ شان نہیں ہو سکتا۔ پاکستان کی "اسلامی حکومت"، کس منہ سے یہ غیر اسلامی اور انسانیت سوز ٹیکس اپنے مسلمان عوام پر عائد کرے گی، یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ مطلب یہ ہے کہ پاکستانی حکومت کو اس تین کرور کی آمدنی سے دست بردار ہونا لازمی ہے۔

ریلوے "پنجابی" صاحب "ان۔ ڈبلو۔ ریلوے" کی تقریباً چار ساڑھے چار کرور سالانہ آمدنی جو مرکزی آمدنی ہے پاکستان کی آمدنی شمار کرتے ہیں۔ سنہ ۳۶-۱۹۳۵ء کے مالی سال میں اس ریلوے سے حکومت ہند کو ۴ کرور ۳۴ لاکھ ۶۰ ہزار روپیہ بچت منافع ہوا۔ "پنجابی" صاحب کا خیال ہے کہ یہ آمدنی تمام کی تمام پاکستان کو مل جائے گی۔ لیکن آپ نے یہ غور نہ کیا کہ گرچہ یہ ریلوے مجوزہ پاکستان کے حدود ہی کے اندر پھیلی ہوئی ہے، پھر بھی یہ پاکستانی صوبوں کی ملکیت نہیں، بلکہ یہ "اسٹیٹ ریلوے ہے" اور حکومتِ ہند کی ملکیت ہے۔ ابتداء میں یہ ریلوے ایک کمپنی کی ملکیت تھی، جسے حکومتِ ہند نے سنہ ۱۸۸۶ء میں خرید لیا۔ سنہ ۱۹۲۹ء تک اس ریلوے کا سرمایہ ایک ارب، ۲۴ کرور ۹۵ لاکھ ۶۴ ہزار روپیہ تھا، جو بڑھتے بڑھتے اب تقریباً دو ارب ہو گیا ہے۔

پاکستانی حکومت کو یا تو اسے حکومتِ ہند سے یک مشت ۲ ارب کی رقم ادا کر کے خرید لینا ہوگا، یا پھر اس کے سرمائے پر ایک بڑی رقم سالانہ بطور سود ادا کرنا ہوگا۔ لیکن اوّل الذکر صورت پاکستان کیلئے ناممکن ہے، کیونکہ اس کے پاس اتنی بڑی رقم موجود نہیں، اور دوسری صورت میں، اسے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ چار پانچ کرور سالانہ کا جو منافع اس ریلوے سے ہوگا، اُسے پاکستان کو سود کی شکل میں حکومت ہند کو ادا کر دینا پڑیگا۔

اتنا ہی نہیں — ہمیں یہ بھی ڈر ہے کہ شاید علیحدگی کے بعد "ان۔ ڈبلو۔ ریلوے" کی موجودہ آمدنی بھی برقرار نہ رہے۔ ریلوے کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ مال ہے۔ اسوقت

ایک ملک ہونے کی وجہ سے ہندستان اور پنجاب وغیرہ کے درمیان بے روک ٹوک مال آتا جاتا ہے۔ لیکن دوؔ ملک ہو جانے پر یقینی یہ صورت باقی نہ رہے گی چنگی عائد ہونے کے سبب مال کے رسل ورسائل میں کافی تخفیف ہو گی۔ اسی طرح پاسپورٹ وغیرہ کی دقتوں کے سبب مسافروں کی آمدورفت میں بھی کمی واقع ہو گی۔ غرضیکہ علیحدگی کے بعد پاکستان، ایران یا افغانستان کی طرح ایک ملک ہو جائے گا۔ اور اس کے رسل ورسائل زیادہ تر اپنے حدود کے اندر ہی محدود رہیں گے۔

غرضیکہ ہمارے خیال میں این۔ ڈبلو۔ ریلوے سے حکومت پاکستان کو نفع سے زیادہ نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے۔ جو یقینی اس مفلس وقلاش حکومت کیلئے ناقابلِ برداشت ہوگا۔ ہندستان میں اس وقت جتنی ریلویز ہیں، ان میں اکثر خسارہ ہوتا رہتا ہے[۱]۔ لیکن

[۱] اور تقریباً تمام ریلویز میں ہو چکا ہے

حکومتِ ہند کا یہ دستور ہے کہ وہ ملک کی تمام (سرکاری) ریلوے کا منافع ان ریلویز کے درمیان تقسیم کر دیتی ہے، اور جو خسارہ ہوتا ہے اُسے خود برداشت کر لیتی ہے۔ اس طرح ریلوے کے خسارے کا یہ بوجھ کسی تنہا صوبے پر نہیں بلکہ سارے ملک پر پڑتا ہے۔ لیکن پاکستانی حکومت کو یقینی اتنی سکت نہیں کہ وہ ہر سال کروروں کا خسارہ برداشت کرے۔ پاکستان جیسے چھوٹے ملک کے لئے یہ یقینی ناقابل برداشت ہوگا۔ ریلوے کے خسارے کا بوجھ پڑنے سے یہ نتیجہ ہوگا کہ پاکستانی حکومت کا بجٹ ہر سال گڑبڑ ہوتا رہے گا۔

ڈاک اور تار کے ذریعہ حکومتِ ہند کو اس وقت پاکستانی صوبوں سے تقریباً دوؔ کرور روپیہ سالانہ کی آمدنی ہے، لیکن پاکستان کی علیحدگی کے بعد ریلوے کی مانند تار اور ڈاک کی آمدنی بھی کم ہو جائے گی۔ پاکستان اور ہندستان دوؔ علیحدہ علیحدہ ملک ہو جانے کے سبب ان دونوں کے درمیان فی الحال جو تعلقات ہیں، وہ بہت کم ہو جائیں گے۔ پھر خط وکتابت اور تار کے محصول میں بھی غیر ملک ہونے کے سبب اضافہ ہو جائے گا۔ جس کے سبب تعلقات میں مزید کمی واقع ہو گی اور ڈاک وتار کے محکمے کی آمدنی گھٹے گی۔ پھر یہ بھی ہے کہ محکمۂ ڈاکخانہ وٹیلیگراف کا جملہ اثاثہ حکومتِ ہند کی

ملکیت ہے۔ پاکستانی حکومت کو کروروں روپیے ان کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔

مرکزی حکومت (ہند) کو تقریباً سوا کرور روپیہ سالانہ کی رقم پاکستانی صوبوں سے بطور انکم ٹیکس مل جاتی ہے۔ یہ رقم یقینی بہت تھوڑی ہے اور پانچ کرور کی عظیم الشان آبادی سے سوا کرور سالانہ انکم ٹیکس وصول ہونا، ان صوبوں کے انتہائی افلاس کی دلیل ہے۔ لیکن اس رقم میں اُس وقت تک اِضافہ بھی نہیں ہو سکتا۔ تاوقتیکہ ملک میں صنعت و حرفت کی ترقی نہ ہو۔ ہندوستان، اور خاصکر پاکستانی صوبوں میں زراعت کی ایسی حالت نہیں کہ اس پر کوئی زراعتی انکم ٹیکس (AGRICULTURAL INCOME-TAX) لگایا جاسکے۔ لہذا اس قسم کا جو ٹیکس عائد کیا جائے گا وہ صنعت و تجارت ہی پر عائد ہوگا۔ جس کی زبوں حالی شمالی و مشرقی صوبوں میں عیاں ہے۔

'پنجابی' صاحب نے پاکستان کی آمدنی میں تین لاکھ کی رقم افیون کے ٹیکس کی بھی دکھلائی ہے، جو فی الحال شمالی و مشرقی صوبوں سے حکومتِ ہند کے خزانے میں جاتی ہے۔ لیکن شاید پنجابی صاحب یہ سہو کر گئے کہ پاکستان میں ایک اسلامی حکومت ہوگی جس میں افیون، چرس، گانجہ، تاڑی، شراب اور تمام منشیات ممنوع قرار دیئے جائیں گے۔ لہذا اس رقم سے تو یقینی انھیں دست بردار ہونا پڑے گا۔ پھر سندھ، کشمیر، سرحد اور پنجاب کی حکومتوں کو محکمۂ آبکاری سے جو کروروں روپئے کی آمدنی ہے، اس حرام آمدنی سے بھی یقینی درگذر کرنا پڑے گا۔ 'پنجابی' صاحب اپنی کتاب میں متعدد مقامات پر یہ فرما چکے ہیں کہ پاکستان کی حکومت میں قرآنی احکام نافذ کئے جائیں گے۔ لہذا اگر ہم یہ امید کریں اور غالباً مسٹر جناح اور مسلم لیگ بھی اس سے متفق ہوگی کہ (اگرچہ اس سے کانگریس کی تقلید ہوتی ہے) پاکستان میں منشیات کا استعمال قطعاً ممنوع قرار دیدیا جائے گا، تو یہ غلط نہیں۔

اِس سلسلے میں 'پنجابی' صاحب نے جو سب سے بڑی غلطی کی ہے وہ یہ ہے کہ شمالی و مشرقی صوبوں کی موجودہ آمدنی کو پاکستان کی آمدنی قرار دے کر اسے جیوں کا تیوں رکھدیا ہے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ جب اس قدر بنیادی طور پر حالات بدلیں گے کہ یہ صوبے ہندستان

کا ایک جزو ہونے کے عوض ایک علیحدہ ملک ہو جائیں گے تو لازمی طور پر اس کی اقتصادیات وغیرہ میں بھی بنیادی تغیر و تبدل واقع ہو گا۔ مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں غالباً یہ امر واضح ہو گیا ہو گا کہ پاکستان کی مالی حالت اس قدر کمزور اور ناگفتہ بہ ہے کہ اگر بفرض محال یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کی وہ تمام آمدنی جو فی الحال حکومتِ ہند کو ملتی ہے، پاکستانی حکومت کو مل جائے گی، تو بھی پاکستان ایک آزاد اور خود مختار سلطنت کا خرچ برداشت نہیں کر سکتا۔

کانفڈریسی کے مصارف

ایک آزاد ہندستان کی احدیہ (کانفڈریسی) کے مصارف موجودہ مرکزی حکومت سے کہیں زیادہ ہوں گے کیونکہ اسے ایک بڑے پیمانے پر ہندستان کے دفاع کا انتظام کرنا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ یہ مصارف کانفڈریسی میں شامل ہونے والے پانچ وفاقوں (سندھستان، ہندستان، راجستھان، بنگال اور دکنی ریاستوں کے فیڈریشنوں) کو برداشت کرنے پڑیں گے۔ لیکن 'پنجابی' صاحب نے کسی جگہ یہ بتلانے کی زحمت گوارا نہ فرمائی کہ کانفڈریسی کے لئے سندھستان کا کیا چندہ ہو گا اور وہ کہاں سے آئے گا۔ اس سلسلے میں پنجابی صاحب لکھتے ہیں:—

> "کانفڈریسی میں شامل ہونے والے فیڈریشن یا تو براہ راست اسے ایک مقررہ رقم بطور خراج دینا منظور کریں گے یا اپنے محاصل کی چند مدات اس امر کے لئے مخصوص کر دیں گے، جس سے ایک مقررہ رقم کانفڈریسی کو دی جایا کرے گی۔"
>
> "ہم یہاں یہ بتلا دینا چاہتے ہیں کہ شمالی و مغربی فیڈریشن کسی حالت میں بھی اپنی چنگی کی مد کانفڈریسی کیلئے وقف نہ کرے گا۔"
>
> (کانفڈریسی آف انڈیا صفحہ ۲۱۲)

چنگی کی آمدنی کانفڈریسی کو دی جائے یا نہ دی جائے یہ ایک علیحدہ چیز ہے، لیکن یہ سوال اپنی جگہ پر قائم رہ جاتا ہے کہ آخر پاکستان، کانفڈریسی کو اپنا چندہ کہاں سے دے گا۔ گرچہ کانفڈریسی کے مصارف موجودہ حکومتِ ہند سے کہیں زیادہ ہوں گے، تاہم

سندھستان کو کم ازکم اتنی رقم تو مرکز کو ضرور دینی پڑے گی جو وہ موجودہ صورت میں حکومتِ ہند کو دیتا ہے۔ چنگی کی آمدنی آپ نہ دیں آپ کو اختیار ہے لیکن کسی دوسری مد سے بہرحال آپ کو ۲۴۔۲۵ کروڑ روپئے کانفڈریسی کو دینے پڑیں گے، جس کے بغیر کل ہند کانفڈریسی میں پاکستان کی شرکت ناممکن ہے۔ لیکن یہ رقم کانفڈریسی کو دینے کے بعد سندھستان فیڈریشن کے اخراجات کہاں سے آئیں گے؟ صوبوں کی آمدنی تو اتنی بھی نہیں کہ وہ اپنا خرچ پورا کرسکیں۔ علاوہ اس کے صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کا ڈھائی تین کروڑ کا خسارہ بھی حکومتِ پاکستان کو پورا کرنا ہوگا۔ یہ گراں قدر رقم کی بھی ظاہرا کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

شمالی و مغربی مسلم صوبوں سے مرکزی حکومت کو جو رقمیں چنگی اور دوسرے محاصل کی صورت میں ملتی ہیں، ان کا 'پنجابی' صاحب نے بڑے مبالغے کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ لیکن اس حساب کے گوشوارے کے نیچے یہ نوٹ بھی لگا دیا ہے:—

"یہ اعداد و شمار اس مفروضے پر مبنی ہیں کہ سندھستان فیڈریشن، کانفڈریسی میں شامل نہ ہوگا۔"

(فٹ نوٹ، صفحہ ۲۱۶، کانفڈریسی آف انڈیا)

آخر یہ کیا مذاق ہے؟ اپنی پوری اسکیم کی بنیاد ایک کل ہند کانفڈریسی پر رکھنے کے بعد جب کانفڈریسی کے اخراجات کا سوال سامنے آیا تو فرماتے ہیں کہ سندھستان فیڈریشن، کانفڈریسی میں شامل ہی نہ ہوگا۔ ناظرین غور فرمائیں کہ ایک ایسے اہم سوال پر کہ پاکستان، آل انڈیا کانفڈریسی میں شامل ہوگا یا نہ ہوگا، 'پنجابی' صاحب کا دماغ صاف نہیں، اور وہ متضاد بیانات دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کانفڈریسی میں شامل ہونا یا نہ ہونا دو مختلف شکلیں ہیں، اور ہر دو صورت میں پاکستان کی مختلف شکل اور مصارف ہوں گے۔

پاکستان اور دفاع

اوپر ہم دیکھ چکے ہیں کہ اگر پاکستان کل ہند کانفڈریسی میں شامل ہوگا تو اس کی مالی حالت کیا ہوگی، لہٰذا اب دوسری صورت پر

بھی غور کر لینا ہے۔ سندھستان فیڈریشن اگر کانفڈریسی میں شامل نہیں ہوتا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اس کی شکل ایک خود مختار آزاد سلطنت کی ہوگی، جسے اپنی دفاع (DEFENCE) کا خود انتظام کرنا ہوگا۔ لہٰذا ہمیں پاکستان کے دفاع کے اخراجات کا جائزہ لینا چاہیئے۔ پھر بین الاقوامی تعلقات اور سفارتخانوں کے اخراجات بھی ہیں، جو بطور خود کروروں کی رقم ہوگی۔

جب ہم پاکستان کے حدود پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں پاکستان کی ڈو سمت کی سرحدیں ایسی نظر آتی ہیں جن پر بیرونی حملے کا ڈر ہے، اور پاکستان کو ان کی حفاظت کرنی ہوگی۔ یعنی اوّل تو شمالی و مغربی سرحد اور دوسرے ہندستانی سرحد، (جہاں پاکستان کے حدود، ہندو، ہندستان سے ملیں گے)

شمالی ومغربی سرحد

یہ سرحد تقریباً ایکہزار میل تک پھیلی ہوئی ہے، جس میں آٹھ درّے ہیں اور کسی جگہ ۶ ہزار فیٹ سے زیادہ بلندی نہیں۔

ان درّوں میں خیبر اور بولن ڈو درّے بہت آسان ہیں اور اکثر آمد رفت ان ہی ڈو درّوں سے ہوتی ہے۔ ہندستان پر جس قدر حملے ہوئے ان میں اکثر ان ہی دو راستوں سے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک درّہ، کارا کورم کی پہاڑیوں سے نکل کر سنکیانگ، یعنی چین کی سرحد سے بھی جا ملتا ہے۔ حکومت برطانیہ کو اس سمت سے جو سب سے بڑا خطرہ رہا ہے، اور جو گذشتہ پچاس۵۰ سال سے برطانیہ کی سرحدی پالیسی پر فیصلہ کن اثر ڈالتا رہا ہے، وہ روس ہے۔ روس بڑھتے بڑھتے افغانستان کی سرحد سے آملا ہے اور ہندستان اور روس کے درمیان صرف افغانستان کا ایک چھوٹا سا ملک رہ گیا ہے۔ بعض مقامات پر تو ہندستان اور روس کی سرحد کے بیچ صرف ۷۵ یا زیادہ سے زیادہ سو۱۰۰ میل کا فرق رہ گیا ہے۔ مثلاً کشمیر اور روسی صوبے یارقند کے بیچ سو۱۰۰ میل سے زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ اگرچہ روس کی حکمت عملی دوسرے سامراجی ملکوں کی طرح جابرانہ اور غاصبانہ نہیں، لیکن پھر بھی طاقتور پڑوسیوں کا لحاظ رکھتے ہوئے چھوٹے ملکوں کو ہمیشہ اپنی مدافعت کا پورا انتظام رکھنا پڑتا ہے۔

پاکستان کی شمالی و مغربی سرحد
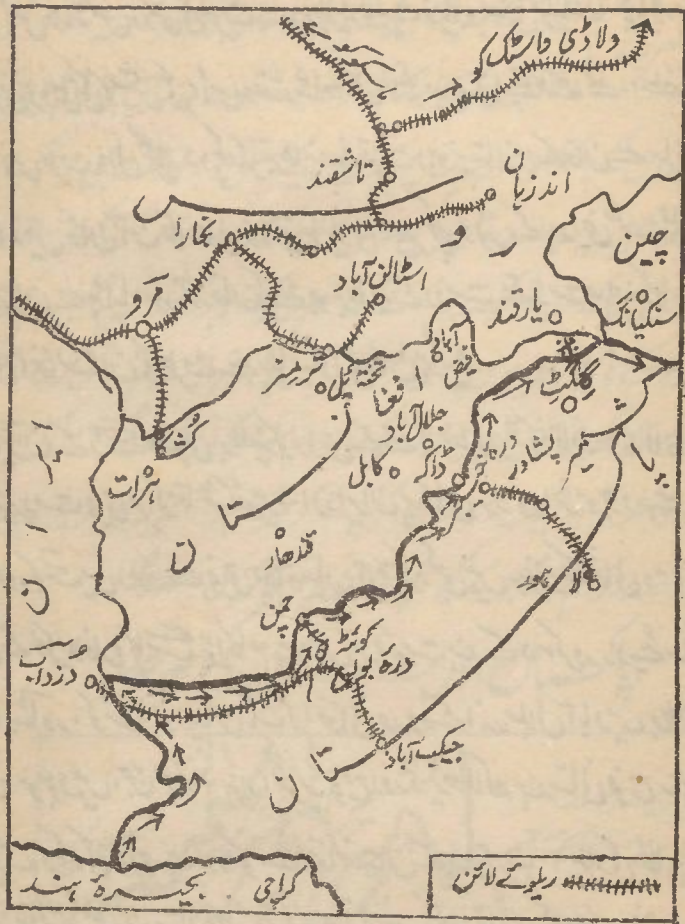
۱۹۲۱ء میں روس نے ہرات - قندھار - بولن کے راستے پر خاص توجہ دی تھی - اور برطانیہ سے اپنی محافظت کیلئے اُسنے افغانی سرحد پر اپنے کو کافی مضبوط کر لیا تھا - اُس وقت افغانستان کی حکومت اور روس سے بہت زیادہ دوستانہ تعلقات تھے، جس کے سبب روس کو متعدد مراعات ملیں - ہرات - قندھار روڈ روس ہی کے سرمائے سے بنی - افغانستان کی شمالی سرحد پہ کشک تک روسی ریلوے لائن لائی گئی اور اس لائن کے جنکشن پر مرو (MERVE) میں روسی فوج کا مرکز قائم ہوا فیض آباد، تختہ پل اور ہرات میں روس نے زبردست قلعے بنوائے - غرضیکہ اس طرح روسی ریلوے لائن اور اس کا فوجی مرکز ہندستانی ریلوے لائن (چمن) سے صرف ۵۰۴ میل پر آگیا ہے - افغانستان کے شمال میں ترمز کے مقام پر روسی

ریلوے کا ایک اور اسٹیشن بنا ہے، جس سے ہندستانی ریلوے (پشاور) کا اسٹیشن صرف دوسو ۲ میل رہ جاتا ہے۔

اُس زمانہ میں روس کی طرف سے برطانیہ کو بہت زیادہ کھٹکا ہو گیا تھا۔ چنانچہ برطانیہ نے افغانستان سے بہتیری دوستی کی کوشش کی، اُس وقت شاہ امان اللہ سریر آرائے تخت تھے۔ اسلئے برطانیہ کو ادھر کامیابی نہ ہوئی۔ اس طرف دال گلتی نہ دیکھکر برطانیہ نے قلات (بلوچستان) کے خان سے سازباز کی اور ۱۹ ہزار پونڈ سالانہ میں خان آف قلات کی دوستی خرید لی۔ پھر کچھ دنوں کے بعد اپنی حکمت عملی سے امان اللہ خان کو افغانستان سے ہٹایا۔ اور نادر خاں کیلئے جو برطانیہ کے دوست تھے راستہ صاف کیا۔ لہذا ان کے تخت پر آتے ہی افغانستان کی طرف سے برطانیہ کو اطمینان ہو گیا۔

ایران کے راستے سے بھی برطانیہ کو روس کے حملے کا خطرہ رہا۔ کوہ قاف (CAUCASUS) میں روس نے زبردست فوجی مراکز قائم کئے ہیں۔ اور ایران پر کافی روسی اثر موجود ہے۔ اسی لئے برطانیہ نے بصرہ اور کویت میں زبردست فوجی چھاؤنیاں قائم کر رکھی ہیں۔ غرضیکہ شمالی و مغربی سرحد کی محافظت ہندستان کے محکمۂ دفاع کا سب سے بڑا کام ہے، جس پر حکومت ہند کے ۳۵ کرور روپئے سالانہ صرف ہوتے ہیں۔ گلگت، پشاور، کوئٹہ، اور یہاں تک کہ افغانی حدود کے اندر جلال آباد میں برطانی فوج کی زبردست چھاؤنیاں موجود ہیں، جن میں ۶۰ ہزار انگریز فوج اور ڈیڑھ لاکھ ہندستانی فوج رہتی ہے۔ ایران کے پاس ایک لاکھ کی فوج ہے اور حکومت افغانستان کے پاس صرف ۶۰ ہزار کی ظاہر ہے کہ اگر روس جیسی بڑی طاقت کبھی ہندستان کا رُخ کرے تو اس کے مقابلے کے لئے یہ فوجیں بالکل ناکافی ہیں۔

الغرض پاکستانی حکومت پر، ہندستان سے علحدگی کے بعد جو سب سے بڑا بوجھا پڑے گا وہ شمالی و مغربی سرحد کی محافظت کا ہوگا۔ اس کام کیلئے کم از کم اتنی فوج تو رکھنی ہی پڑے گی، جتنی حکومت ہند کو رکھنی پڑتی ہے۔ لیکن اتنی فوج رکھنے کیلئے ۳۵ کرور روپیہ سالانہ کی ضرورت ہے، جس کا مہیا کرنا پاکستان کے بس کی بات نہیں۔

میں نے سرزمین بے آئین یعنی وزیرستان کے وزیریوں اور افریدیوں کے خطرے کا ذکر نہ کیا، کیونکہ پاکستانی بھائیوں کو یہ خوش فہمی ہے کہ یہ قبائل حلقہ بگوشان اسلام ہونیکی وجہ سے پاکستان کی "اسلامی سلطنت" کا احترام کریں گے، اور اپنا لوٹ مار اور جنگ و جدال کا پیشہ چھوڑ کر گھر گرہست بن جائیں گے۔ بہرحال ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اگر یہ قبائل حملہ آور ہوں بھی تو پاکستانی حکومت ان سے نبٹ سکتی ہے۔ بشرطیکہ

وہ ڈیڑھ دو لاکھ کی مستقل فوج سرحد پر رکھے۔ لیکن اگر کبھی افغانستان یا ایران کی نیت بدلی تو پاکستان کا کیا حشر ہوگا۔ ممکن ہے پاکستانی بھائی اپنا ملک برضا و رغبت اُن کے حوالے کر دیں، کیونکہ آخر وہ بھی تو مسلمان ہی ہیں۔

مشرقی جنوبی سرحد

علیٰحدگی کے بعد پاکستان کیلئے ہندو ہندستان بھی کم خطرناک نہ ہوگا اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آزاد ہونے کے بعد ہندستان بھی اتنا ہی طاقتور ہوگا جتنا کہ روس۔ علاوہ اس کے پاکستان اور ہندستان کے درمیان ایک مستقل وجہ مخاصمت بھی ہوگی، جسکی پاکستانی بھائی از خود بنا ڈال رہے ہیں۔ ہندو، ہندستان یہ کبھی نہ بھولیگا کہ پاکستان ہندستان کا ایک جزو تھا۔ اور اس میں مطلق شبہے کی گنجایش نہیں، کہ وہ اپنے کھوئے ہوئے حصّے کے حصول کیلئے برابر کوشاں رہیگا۔ جب ہندو اور مسلمان ایک ملک میں نہیں رہ سکتے تو دو کافر و مومن پڑوسی سلطنتیں آپس میں بغیر لڑے بھڑے کس طرح رہ سکتی ہیں؟

غرضیکہ پاکستان کو اپنی مشرقی جنوبی سرحد کی زیادہ حفاظت کرنی پڑے گی جس کی وسعت تقریباً چودہ سو میل ہوگی۔ یہ محاذ شملہ کی پہاڑیوں سے تھوڑا اُتر ہٹ کر شروع ہوگا اور امرتسر، فیروز پور، بہاولپور، خیرپور اور سندھ کے حدود کو ختم کرتے ہوئے کچھ کی کھاڑی میں آ کر مل جائے گا۔

پاکستان اور ہندو ہندستان کی سرحد
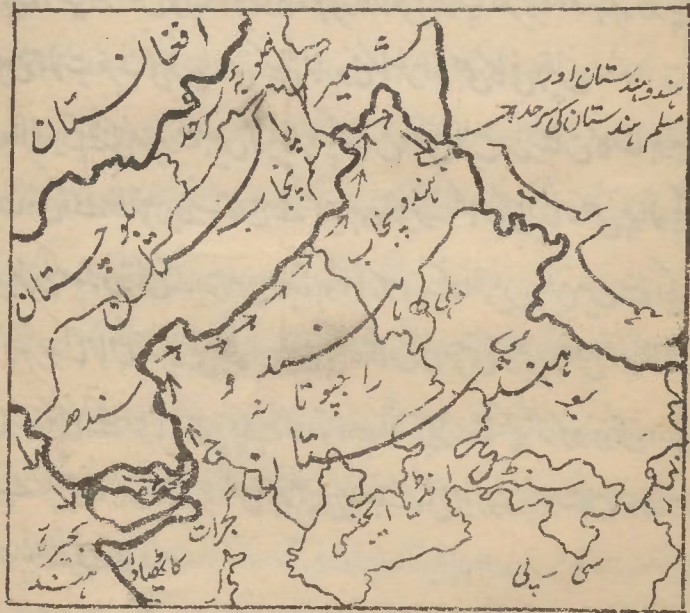
نقشے میں ملاحظہ ہو۔ یہ محاذ ' ب ' سے لیکر ' ج ' تک کی لکیر کے ذریعہ دکھایا گیا ہے۔ ۱۴ سو میل کی سرحد کی مدافعت کوئی آسان کام نہیں۔ حکومتِ پاکستان کو اس کے لئے بھی کم از کم اتنی ہی فوج رکھنی پڑے گی جتنی شمالی مغربی سرحد کی مدافعت کیلئے۔ اور اس طرح اس کام کیلئے مزید ۳۵-۴۰ کرور روپئے سالانہ درکار ہوں گے۔ بلکہ یہ سرحد تو فرانس اور جرمنی کی سرحد کی طرح بالکل کھلی ہوئی ہے، اور کوئی قدرتی روک بھی اس کے درمیان نہیں۔ لہٰذا ہمارا خیال ہے کہ پاکستان کو بھی اس کھلی ہوئی سرحد کی حفاظت کیلئے کھربوں روپئے کے صرفے سے کوئی میشر یو لائن (MAGINOT LINE) بنانی ہوگی، اور شملہ سے لیکر کچھ کی کھاڑی تک آہنی قلعوں کی ایک دیوار تعمیر کرنی ہوگی۔

اتنا ہی نہیں — پاکستان کو اپنی حفاظت کیلئے جدید سامانِ حرب کی بھی ایک بڑی مقدار رکھنی ہوگی، جس کے بغیر کسی جدید مسلح قوم کا دو دن بھی مقابلہ کرنا مشکل ہوگا۔ پاکستان کو کھربوں روپئے خرچ کر کے مشین گنیں، مسلح موٹر کاریں، ٹینک، ہوائی جہاز اور قیمتی آتشگیر مادے فراہم کرنے ہوں گے۔ ان سامانِ حرب کیلئے کتنی رقم درکار ہوگی وہ اسی سے ظاہر ہے کہ ایک ٹینک کی قیمت ایک لاکھ ۸۶ ہزار روپئے۔ جنگی ہوائی جہاز کی قیمت ۲ لاکھ ۷۰ ہزار، مسلح موٹر کار ۱۲ ہزار روپئے، طیارہ شکن توپ ۲ لاکھ ۷۵ ہزار اور معمولی توپ تقریباً ۵۰ ہزار روپے میں آتی ہے ظاہر ہے کہ ان آلاتِ حرب کی خریداری کیلئے قارون کا خزانہ بھی کافی نہیں۔

بہر حال یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بیچارہ پاکستان، کسی طرح ہندستان کا مقابلہ نہیں کر پائے گا۔ اور ایک نہ ایک دن اسے طاقتور ہندستان سے ملحق ہو جانا پڑے گا۔ اگر ایسا نہ بھی ہوا تو پاکستان کو، افغانستان کی طرح 'یا تو ہندستان کے اثر میں رہنا ہوگا یا روس کے اثر میں (جن میں سے ایک 'کافر' ہے، اور دوسرا 'دہریہ') ان سرحدی جنگوں میں پاکستان کی مرضی کو بھی دخل نہ ہوگا اور وہ اگر روس یا ہندستان سے لڑنا نہ بھی چاہے گا، تو اسے لڑنا پڑے گا، کیونکہ وہ روس اور ہندستان کے راستے پر ہے۔ پاکستان کی حالت بالکل بلجیم جیسی ہو جائے گی اور وہ ہندستان اور روس کی ہر کشمکش میں خواہ مخواہ پستا رہے گا۔

میں نے بحری فوج اور بیڑے کے اخراجات کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن کراچی کے بندرگاہ اور پاکستان کے

ساحل کی حفاظت کیلئے اسے یقینی بیس پچیس کرور سالانہ کے خرچ سے ایک جنگی بیڑہ رکھنا پڑیگا۔ فاشسٹ طاقتوں کا برطانی سالی لینڈ (افریقہ) تک آجانا اور پھر کراچی کا بمبئی بندرگاہ کے سامنے ہونا، پاکستانی ساحل کیلئے مستقل خطرات ثابت ہوں گے۔

بہرحال ظاہر ہے کہ پاکستان کے وسائل ایسے نہیں کہ وہ اتنے بڑے پیمانے پر دفاع کا انتظام کر سکے جس کیلئے کئی ارب روپئے سالانہ درکار ہیں۔ لہذا اسے اپنے طاقتور پڑوسیوں میں سے کسی نہ کسی کے ساتھ ملحق ہو جانا پڑے گا۔

پاکستان کی اقتصادی غلامی

متذکرہ بالا تفصیلات سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ پاکستان کے موجودہ وسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کیلئے ایک آزاد حکومت کا بار ناقابل برداشت ہے، اور جب تک وہ اپنی صنعت و حرفت کو ترقی نہ دے، اس کا کوئی مستقبل نہیں۔ لیکن پاکستان کو ایک صنعتی ملک بنانے میں صرف قدرتی رکاوٹیں ہی مانع نہیں بلکہ خود محرکین پاکستان بھی اسے اقتصادی طور پر غیر ملکوں کا غلام رکھنا چاہتے ہیں۔ جس کا ثبوت ہم اُن ہی کے حوالے سے دینا چاہتے ہیں۔ پنجابی صاحب اس سلسلے میں لکھتے ہیں:—

"محافظتی (PROTECTIONIST) پالیسی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ صنعتی ہندستان کو، جو قدرتی طور پر ہندو۔ ہندستان ہے، کیونکہ ہندو ہی سرمایہ دار ہیں، فائدہ پہونچے گا اور زراعتی ہندستان کو، یعنی زیادہ تر مسلم شمال و مغرب، کو نقصان پہنچے گا۔ ان حصص کی زراعتی پیداوار ملک ہی میں رہ جائیگی اور کاشتکاروں کو ان کی اس قدر قیمت نہ مل سکے گی، جتنی انھیں کھلے بازار میں مل سکتی ہے۔ کیونکہ صنعتی ممالک کے خلاف زائد شرح چنگی عائد کر دینے سے ان پر (مسلم کاشتکاروں پر) کھلے بازار کا دروازہ بند ہو جائیگا۔ ضرورت سے فاضل زراعتی پیداوار، بیرونی بازار نہ ملنے کے سبب، ہندستانی کارخانہ داروں کے ہاتھ فروخت کر دینی پڑے گی، جو بیرونی مقابلہ نہ ہونے کے سبب اسے جس دام پر چاہیں گے لیں گے۔ اور چونکہ درآمد کی کمی کے سبب ان کے تیار شدہ مال کا کسی سے مقابلہ نہ پڑے گا، لہذا وہ اپنی مصنوعات کا جس قدر دام چاہیں گے وصول کریں گے۔ یہ کسانوں کیلئے بہت ہی نقصان دہ ہوگا کیونکہ اول تو انھیں اپنی پیداوار کے لئے قیمت کم ملے گی اور دوسرے انھیں تیار شدہ مال زیادہ

دام دے کر خریدنا پڑے گا۔"

(کانفڈریسی آف انڈیا۔ صفحہ ۱۰۲ و ۱۰۳)

یہاں پنجابی صاحب نے ایک عجیب و غریب منطق پیش کی ہے، جس پر ہر سلیم العقل انسان کو حیرت ہوگی آپ کے اس استدلال پر روشنی ڈالنے سے پہلے ہم ایک غلط بیانی کی تردید کر دینا چاہتے ہیں۔ پنجابی صاحب نے ایک طویل بحث (صفحہ ۹۹ تا ۱۱۷) میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، جیسا کہ مندرجہ بالا اقتباس سے بھی ظاہر ہے، کہ ہندوؤں کے مفاد صنعتی ہیں، اور مسلمانوں کے مفاد زراعتی ہیں، اور یہ دو قومیں متضاد مفاد کی مالک ہیں۔ مسلمان خام اشیاء پیدا کرتے ہیں، اور انھیں ہندو کارخانہ دار سستے داموں پر خرید کر مسلمانوں کا استحصال (EXPLOITATION) کرتے ہیں۔ لیکن پنجابی صاحب کا یہ بیان صحیح نہیں کیونکہ ہندستان میں ہندو کاشتکاروں کی تعداد مسلم کاشتکاروں سے کہیں زیادہ ہے۔ اگر پنجاب، بلوچستان، صوبۂ سرحد اور سندھ کے سوا دو کروڑ مسلمانوں کے مفاد زراعتی ہیں تو بہار، یو۔پی، سی۔پی، اڑیسہ، آسام، مدراس، بمبئی اور چھ سو ریاستوں کے ۲۱-۲۲ کروڑ ہندوؤں کے مفاد بھی زراعتی ہی ہیں، اور ان کا پیشہ زراعت کے سوا کچھ نہیں۔ صنعتی مفاد دس، بیس لاکھ یا زیادہ سے زیادہ ایک کروڑ ہندوؤں کا ہو سکتا ہے، جو کروڑوں ہندو اور مسلمان کاشتکاروں کا استحصال کرتے ہیں۔ یہ سرمایہ دار صرف پنجاب اور سندھ کا گیہوں اور روئی سستے داموں نہیں خریدتے بلکہ سارے ہندستان کا کچا مال، جس کے پیدا کرنے والوں میں ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہے، کم داموں پر خریدتے ہیں۔ علاوہ اس کے ہندو صناع اپنے ملوں کے تیار شدہ مال صرف مسلمانوں ہی کے ہاتھ زیادہ داموں میں بیچ کر فائدہ نہیں اٹھاتے بلکہ وہ اپنے ہندو بھائیوں کے ہاتھ بھی ان ہی داموں میں بیچتے ہیں، اور ان سے بھی اسی طرح مستفید ہوتے ہیں۔

بہرحال پنجابی صاحب کے استدلال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سوشلزم چاہتے ہیں۔ کیونکہ آپ کا اعتراض چھپے لفظوں میں سارے سرمایہ دارانہ نظام پر ہے، جس میں چند سرمایہ دار محنت کرنے والوں سے کم داموں میں خام پیداوار خرید کر ان کے ہاتھ اپنا تیار شدہ مال زیادہ داموں میں بیچتے ہیں۔ لیکن آپ اپنی بحث کو اس منطقی نتیجہ پر نہیں پہنچاتے کہ ہندستان کے تمام خام اشیاء پیدا کرنے والوں کو مل کر اس سرمایہ دارانہ اور استحصالی نظام کا خاتمہ کر دینا چاہیے تاکہ ان کی پیداوار کی قیمت بھی زیادہ ملے، اور تیار شدہ مال بھی کم قیمت میں مل جائے۔

لیکن آپ غریب مسلمانوں کے جذبات کو اُبھار کر انھیں دوسری طرف لے جاتے ہیں، اور انھیں تمام ہندستان کے تمام ہندو کاشتکاروں سے علیحدہ کر کے ایک علیحدہ ملک بنانا چاہتے ہیں، جس کا مقصد مسلم سرمایہ داری کے قیام کے سوا کچھ نہیں۔

ہاں! تو پنجابی صاحب کی عجیب و غریب منطق یہ ہے کہ چونکہ خام پیداوار کا دام غیر ممالک زیادہ دیتے ہیں، اس لئے اپنے ملک کی خام اشیاء ان کے ہاتھ بیچ دینا چاہئے اور چونکہ یہ غیر ممالک اُس وقت تک ہماری خام اشیاء نہ خریدیں گے، جب تک ان کے تیار کردہ مال کی ہم خریداری نہ کریں، اسلئے ان کی مصنوعات بھی ہمیں خرید لینی چاہئے۔

اپنے اس استدلال کی تائید میں پنجابی صاحب نے سر عبد اللہ ہارون کا وہ بیان نقل کیا ہے جو انھوں نے لنکا شائر کے پارچہ بافوں کے وفد سے ملاقات کے بعد ۲۲ مئی ۱۹۳۸ء کو شملے سے دیا تھا:۔

"جہاں تک اعداد و شمار مجھے مل سکے ہیں، یہ امر عیاں ہے کہ ترجیحی چنگی میں تخفیف کے باوجود پچھلے پانچ برسوں میں لنکا شائر سے ہندستان کی درآمد ۷۵ سے ۵۰ فی صدی تک گھٹ گئی ہے۔ لہٰذا یہ ایک قدرتی بات تھی کہ لنکا شائر کا وفد ہندستان سے اُس قدر درآمد حاصل کرنے کیلئے کوشاں نہ تھا جو اُسے دس یا پندرہ سال قبل حاصل تھی۔ یعنی ایک ارب بیس کروڑ گز سالانہ۔ بلکہ اب وہ چالیس کروڑ گز سے کچھ اوپر کی خریداری چاہتا تھا، جو اس کی (لنکا شائر) گذشتہ تین برسوں کی سالانہ اوسط ہے۔ اسکے بدلے میں لنکا شائر ہندستانی روئی زیادہ مقدار میں خریدنے کے لئے تیار تھا، جیسا کہ گذشتہ تین برسوں سے اس کا قاعدہ رہا ہے۔ لیکن ہندستانی صنعت پارچہ بافی کے نمائندوں کے خود غرضانہ رویّہ کی بنا پر کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ کیونکہ یہ نمائندے لنکا شائر کو خاطر خواہ ترجیح دینے کے لئے تیار نہ تھے جس سے لنکا شائر ہندستانی بازار میں اپنے مال کی ایک مناسب مقدار پہنچا سکتا۔ - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - -

بہر حال مجھے کسی طرح یہ معلوم ہوا کہ اگر لنکا شائر والوں کو اُسقدر کپڑا ہندستان بھیجنے کی اجازت دیدی جاتی، جو گذشتہ پانچ برسوں میں ان کا اوسط رہا ہے، تو وہ ہمیں ہماری روئی کی خریداری کا یقین دلانے کے لئے تیار تھے۔"

(کالونیزیسی آف انڈیا، مصنفہ پنجابی، صفحہ ۱۱۱ و ۱۱۲)

مندرجہ بالا تحریر پڑھنے سے شاید آپ کو یہ دھوکا ہوگا کہ یہ لنکا شائر کے کسی انگریز تاجر کی تحریر ہے۔ لیکن نہیں، ابھی ہندستان میں خود لنکا شائر کے سینکڑوں وطن فروش ایجنٹ موجود ہیں۔

شاید دنیا کا گرا سے گرا ہوا ملک بھی آج اس حقیقت کو سمجھ گیا ہے کہ بدیسی مصنوعات کی خریداری سے ملک کی دولت غیر ملکوں میں چلی جاتی ہے، اور ملک کی غربت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہندستان کی گذشتہ پچاس سالہ سیاسی جدوجہد قریب قریب اسی پر مرکوز تھی کہ غیر ملکی اشیار کا بائیکاٹ کیا جائے اور سودیشی مصنوعات کی ہمت افزائی کی جائے۔ لیکن پاکستان کے یہ فلسفی اور مسلم لیگ کے لیڈر لنکا شائر کی مصنوعات کو ہندستانی بازاروں میں دیکھنے کے کس قدر متمنی ہیں۔ یہ مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہو جاتا ہے۔

لیکن غور کرنے کی بات ہے کہ اگر اسی طرح پاکستانی مسلمان غیر ملکوں کے ہاتھ اپنا کچا مال بیچتے رہے، اور لنکا شائر وغیرہ کی فیکٹریوں کا بنا ہوا تیار شدہ مال خریدتے رہے تو آخر پاکستان میں صنعت و حرفت کی ترقی کے کیا امکانات ہیں؟ پاکستان کچا مال بدیس والوں کے ہاتھ بیچ ڈالے گا، اور چونکہ اس کو فروخت کرنے کیلئے تیار شدہ مال خریدنے کی بھی ضرورت ہے۔ اس لئے بدیسی مال خریدے گا۔ اور یہ سائیکل کا چکر چلتا رہے گا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ ملک میں کچا مال مل سکے گا اور نہ کوئی کل کارخانہ ہی کھل سکے گا۔ اغیار دو چار آنہ زیادہ دے کر سارا مال لے جائیں گے۔ اور ایک روپئے کی روئی کی خرید کر ۱۲ روپئے کا کپڑا ہمارے ہاتھ بیچ دیں گے، جس سے باہر کے سرمایہ اور محنت کو فائدہ ہوگا اور بیچارا پاکستان دن بدن مفلس ہوتا چلا جائے گا۔

لنکا شائر کے یہ سرپرست مسلمان مسلمانوں کے حقوق سے کس قدر غداری کر رہے ہیں۔ یہ اسی واقعے سے ظاہر ہے کہ اسی لنکا شائر نے ہندستان کی صنعت پارچہ بافی کو، جو تمام تر مسلمانوں (مومن برادران) کے ہاتھ میں تھی، ایسٹ انڈیا کمپنی کی مدد سے تباہ و برباد کر دیا۔ اور کمپنی نے اچھے اچھے کاریگروں کے انگوٹھے کاٹ لئے۔ مسلمانوں کی تباہی کے یہ قصے اس قدر مشہور ہیں کہ ان کی تفصیل میں جانا سیر حاصل ہے۔

غرضیکہ پاکستانی حضرات انگریزوں سے اپنی نہایت عقیدت کی بنا پر پاکستان میں صنعت و حرفت کی ترقی کے تمام امکانات کا ہمیشہ کیلئے سدِّ باب کر دینا چاہتے ہیں۔ موجودہ دنیا میں سرمایہ دار شہنشاہیں یہی تو چاہتی ہیں

کہ ایسے ممالک ان کے ہاتھ آئیں جہاں سے انھیں کچا مال ملے اور ان کی مصنوعات کیلئے وہ بازار کا کام دیں۔ بڑے بڑے ممالک تو اپنے ہاں کچا مال پیدا بھی نہیں کرتے اور اپنی نو آبادیوں سے لاتے ہیں۔ جرمن اور انگریزوں کی موجودہ جنگ یا یوں کہئے کہ گذشتہ دو سو[۲۰۰] سال کی تمام جنگیں نو آبادیوں ہی کی خاطر ہوئیں۔ لیکن ہمارے پاکستانی بھائی سامراجی ملکوں کیلئے یہ سہولتیں بغیر کسی جنگ و جدال کے خود مہیا کر رہے ہیں، وہ کچا مال بھی دینے کو تیار ہیں اور بازار بھی۔ نو آبادیوں کو ہمیشہ یہی شکایت رہی ہے کہ شہنشاہیتیں ان سے کچا مال بھی لے لیتی ہیں، اور ان کا بازار بھی چھین لیتی ہیں۔ لیکن یقینی یہ برطانیہ کی تقدیر ہے کہ اسے برضا و رغبت اپنی نو آبادی کی طرف سے خود یہ پیش کش مل رہی ہے۔

یہ حقیقت آج روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ کوئی ملک صرف زراعتی رہ کر ترقی نہیں کر سکتا اور کچے مال کی برآمد سے آج تک کسی ملک کی پوزیشن نہیں بڑھی ہے۔ ہندستان نے اگر گذشتہ ڈیڑھ دو سو[۲۰۰] برس میں کوئی کام کیا ہے تو وہ یہی کہ دوسرے ملکوں کو کثیر مقدار میں اپنا کچا مال بھیجا ہے اور بدیسی مصنوعات کی خوب خوب ہمت افزائی کی ہے، لیکن اس سے ہندستان خوشحال ہوا ہے یا بدحال اس کا آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اگر بڑے سے بڑا ملک سیاسی حیثیت سے آزاد ہو، اور اس میں صنعت و حرفت نہ ہو تو اس کی پالیسی کا تعین صنعتی ممالک کیا کرتے ہیں۔ اور وہ سیاسی حیثیت سے غلام ہی رہتا ہے۔ اس وقت چین کی پالیسی بڑی حد تک امریکہ کنٹرول کرتا ہے۔ اسی طرح جنوبی امریکہ جیسا عظیم الشان ملک صنعتی ممالک کی انگلیوں پر ناچتا ہے۔ یہی حال مصر، ایران وغیرہ کا بھی ہے۔

بہر حال مقصد یہ ہے کہ زراعتی ممالک آزاد رہتے ہوئے بھی آزاد نہیں رہ سکتے۔ سچی آزادی اور طاقت تو صنعتی ممالک ہی کو حاصل ہو سکتی ہے۔ پاکستان آزاد ہو کر بھی اپنی خام پیداوار کی کھپت کی خاطر انگلینڈ یا امریکہ کا غلام رہے گا۔ آج زراعت میں بھی وہی ممالک آگے ہیں جو صنعت و حرفت میں آگے (INDUSTRIALISED) ہیں۔ ہندستان میں اب تک باوا آدم کے وقت کے دقیانوسی طریقے پر کھیتی ہو رہی ہے۔ جو زراعتی ممالک ٹریکٹر وغیرہ سے کھیتی نہیں کر سکتے، وہ خام پیداوار کے بازار میں بھی پیچھے رہ جاتے ہیں۔ آسٹریلیا، روس، امریکہ وغیرہ ہندستان کے بازار میں اپنا گیہوں پنجاب کے گیہوں سے سستا بیچ سکتے ہیں۔ پنجاب کے چھوٹے ذات کے گیہوں اور سندھ کے چھوٹے ریشے کی روئی کی امریکہ، مصر،

اور جنوبی افریقہ کے بڑے ریشے کی روئی، اور روس، چین، اور امریکہ کے بڑے ذات کے گیہوں سے کیا مقابلہ، جو جدید سائنٹفک طریقوں پر پیدا کئے جاتے ہیں۔ پاکستان کی خام پیداوار کا مقابلہ اس کے فریق پڑوسی ملک یعنی ہندو، ہندستان سے پڑے گا اور ہمیں ڈر ہے کہ شائد ہندو۔ ہندستان کہیں صنعت و حرفت کی طرح پاکستان کو خام پیداوار کے مقابلے میں بھی شکست نہ دیدے۔

پاکستان کے تمام پہلوؤں کا وضاحت سے مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شمالی و مغربی مسلم صوبوں کا فائدہ ہندستان کے ساتھ رہنے ہی میں ہے۔ اگر یہ صوبے ہندستان سے الگ ہو جاتے ہیں تو وہ کسی طرح اپنے پیروں پہ کھڑے نہیں رہ سکتے اور ان کا کوئی مستقبل نظر نہیں آتا۔ اگر وہ دفاع کا معاملہ کانفڈریسی کے سپرد کرتے ہیں تو یا اس کی خود ذمہ داری لیتے ہیں تو ہر حال میں انھیں کروروں روپئے اس مد کیلئے لگانے ہوں گے جس کا پاکستان کے پاس کوئی وسیلہ موجود نہیں۔ پھر ظاہر ہے کہ اس قدر مفلوک الحال حکومت تعلیمی اور دوسرے تعمیری کاموں پر کہاں تک توجہ دے سکتی ہے، جس کی شمالی و مغربی مسلم صوبوں کو سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

۳۔ سیاسی اور آئینی پیچیدگیاں

پاکستان کے تخیّل کو عملی جامہ پہنانے کیلئے صرف اتنا کافی نہیں کہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے ایک تجویز پاس کر دیجائے اور اس کی تائید میں ملک میں سو دو سو جلسے کرائے جائیں۔ بلکہ جب تک اس مطالبے کے پیچھے مسلمانانِ ہند کی بالعموم اور شمالی و مغربی صوبوں کی بالخصوص تائید و حمایت حاصل نہ ہو۔ ان کا یہ مطالبہ ملک کے دوسرے فرقوں اور حکومت کیلئے قابل التفات نہیں ہو سکتا۔ اسکی دو بڑی شکلیں ہو سکتی ہیں۔ اوّل یہ کہ پاکستان کے موافقین و مخالفین کو، قوم کے سامنے اپنا اپنا نقطۂ نظر رکھنے کا کافی موقع دینے کے بعد ایک عام استصواب رائے (GENERAL REFERUNDUM) کیاجائے اور دوسری شکل یہ ہے کہ اس کا فیصلہ تمام بالغ ہندستانیوں کی چُنی ہوئی ایک آئینی مجلس (CONSTITUENT ASSE MBLY) کے مسلم نمایندوں کے حوالے کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں بلاشبہ مسلمانوں کا یہ مطالبہ حق بجانب ہوگا کہ یہ انتخاب، جداگانہ طرزِ نیابت کے اُصول پر ہو اور مسلمان نمائندوں کا انتخاب مسلمان ہی کریں، لیکن مسلمانوں کو اس انتخاب کی پہلی شرط یعنی یہ کہ رائے دہی کا حق چند صاحب جائداد اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کو نہیں بلکہ تمام بالغ مسلمانوں کو ہوگا، تسلیم کرنی پڑے گی۔ اگر اس شرط اور اُصول کو تسلیم کرتے ہوئے ایک عام انتخاب ہوا اور مسلمانوں کے چُنے ہوئے نمایندے اس امر پر متفق ہو گئے کہ مسلمانوں کے مسائل کا حل "پاکستان" ہی ہے تو بلاشبہ حکومت یا ملک کے دوسرے فرقوں کے پاس اس مطالبے کو رد کرنے کی کوئی اخلاقی بنیاد نہ رہ جائے گی۔

لیکن اس حقیقت سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں، نہ صرف تحریک مسلم لیگ بلکہ تحریکِ پاکستان کے لئے بھی مسلمانوں میں کوئی ہمدردی یا جوش نہیں پایا جاتا۔ ہندو اکثریت کے صوبے کے مسلمان ہمیشہ مسلم اکثریتوں کے صوبوں میں مسلم لیگ کے اثر و اقتدار کا اندازہ اپنے صوبوں سے کرتے ہیں اور اس طرح ہمیشہ اس کی صحیح طاقت کے تخمینے میں غلطی کرتے ہیں۔ فرقہ پرور تنظیموں کا جادو زیادہ تر اقلیتوں ہی پر چلتا ہے، اور صحیح یا غلط اقلیتیں انھیں اکثریت سے اپنے بچاؤ اور

محافظت کا ایک آلہ سمجھتی ہیں۔ ہندو مہاسبھا کا جس قدر زور بنگال اور پنجاب میں ہے، وہ دوسرے صوبوں میں نہیں۔ اسی طرح مسلم لیگ کو جو حمایت یو۔پی، بہار اور سی۔پی میں حاصل ہو سکی وہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں نہ ہو سکی۔ اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ اب تک کسی مسلم اکثریت کے صوبے میں 'مسلم لیگ' کی وزارت نہ قائم ہو سکی۔ ظاہر ہے کہ اُن صوبوں میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، مسلم لیگ کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مسلم لیگ ہو یا نہ ہو۔ ان صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت موجود ہے، اور انھیں انتخاب جیتنے یا اپنی وزارت بنانے میں مسلم لیگ اور قائد اعظم کی اعانت کی مطلق ضرورت نہیں۔ وہاں اُنھیں ملکی نظم ونسق اور صوبہ کی ترقی کی تمام جد وجہد سے علٰحدہ ہو کر صرف "حقوق، حقوق" چیخنا نہیں، بلکہ اُن کے کندھوں پر خود حکومت چلانے کا بار ہے، اور وہاں حقوق کیلئے چیخنا، مسلمانوں کا کام نہیں بلکہ ہندو اور سکھوں کا کام ہے۔ چار مسلم صوبوں کی حکومتیں اپنے اپنے مصالح کے مطابق مختلف دوسرے گروہوں سے صلح سمجھوتہ کر کے کام چلا رہی ہیں، اور کسی مسلم صوبے کی کسی وزارت میں مسلم لیگ کا ایک پروگرام بھی نہیں چل رہا ہے۔

بہر حال جہاں تک پاکستانی اسکیم کا تعلق ہے، اب تک صوبہ سرحد یا پنجاب کے کسی وزیر نے اس کی حمایت میں ایک لفظ بھی نہیں کہا، اور نہ بنگال کے عوام ہی نے اس کی تائید کی ہے۔ صوبہ سرحد جس میں بائیس لاکھ مسلمان آباد ہیں، تمامتر کانگریس کے اثر میں ہیں، جہاں کانگریسی وزارت بن چکی ہے۔ یہ سوچنا کہ یہ صوبہ پاکستانی اسکیم کی تائید کرے گا۔ یہ ایک خیالِ خام ہے۔ صوبہ سندھ میں اگرچہ کانگریسی وزارت نہیں رہی، لیکن کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ سندھ کی وزارت ہمیشہ کانگریس کے اثر میں رہی ہے۔ سندھ کے سابق وزیر، خان بہادر اللہ بخش جو آل انڈیا آزاد مسلم کانفرنس کے صدر ہیں، اور کانگریس کے باضابطہ رُکن بھی ہیں، برابر کانگریس کے پروگرام اور پالیسی کو قبول کرتے رہے۔ آپ نے سندھ کے وزرا کی تنخواہ، کانگریس ہی کے اُصول پر پانچ سو روپیہ ماہوار کر دی تھی۔ عہدۂ وزارت سے آپ کی علٰحدگی اس سبب سے نہیں کہ آپ کانگریس دوست تھے، بلکہ اس کی بنیاد سندھ کی پیچیدہ جماعتی سیاسیات ہے۔ چنانچہ موجودہ (بندے علی) وزارت بھی سندھ اسمبلی کی کانگریس پارٹی ہی کے بل بوتے پر قائم ہے۔ اسی لیے

میں سندھ کی وزارت کے رُخ اور رویّہ کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حال میں خان بہادر اللہ بخش معہ اپنی پارٹی کے اس پارٹی میں مِل گئے ہیں۔ جہاں تک صوبہ پنجاب کا تعلق ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کی تحریک، اسی صوبے میں پاس ہوئی اور اس تحریک کو پنجاب کے مسلمانوں کی حمایت حاصل ہے۔ لیکن پنجاب کی سب سے بڑی جماعت یونینسٹ (UNIONIST) پارٹی کے لیڈر اور وزیر اعظم سر سکندر حیات خاں نے ابھی تک اِس اسکیم کی حمایت میں ایک لفظ بھی نہ کہا بلکہ اس کے برعکس اکثر جلسوں میں یہ کہا کہ پنجاب میں نہ مسلم راج ہوگا اور نہ سکھ یا ہندو راج، بلکہ اِن تینوں فرقوں کا راج ہوگا۔ 'پنجابی' کی اسکیم کے مقابلے میں سر سکندر کا، ایک دوسری اسکیم پیش کرنا، جو موجودہ صوبہ وار خود مختاری سے مختلف نہیں، اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ وہ پاکستانی اسکیم کے ساتھ نہیں۔ پھر پنجاب میں ایک بڑی جماعت احراریوں کی بھی ہے جو پاکستان اسکیم کی سختی سے مخالفت کر رہی ہے۔ غالباً ناظرین یہ نہ بھولے ہوں گے کہ حال میں ڈاکٹر خاں صاحب، سابق وزیر اعظم سرحد، سر سکندر حیات، بندے علی اور مسٹر فضل الحق کس طرح مولانا ابو الکلام آزاد سے موجودہ سیاسی مسائل سے متعلق ملتے رہے، اور حالانکہ مسٹر جناح نے سر سکندر حیات اور مسٹر فضل الحق (جو مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن ہیں) اُن کے اس رویّے کے خلاف بیانات بھی دیے، لیکن انھوں نے ان کی کوئی پرواہ نہ کی۔ موجودہ جنگ میں حکومت کی وار کمیٹیوں میں شرکت کے مسئلے پر بھی یہ دو زعماء لیگ نے جس طرح قائد اعظم اور لیگ کی مجلس عاملہ کو ٹھکرایا ہے وہ ظاہر و باہر ہے۔

'پاکستان' کے ایک اور صوبے، یعنی بلوچستان سے بھی اس تحریک کی ابتک تائید نہیں ہوئی اور اس صوبے کی سب سے بڑی سیاسی جماعت 'انجمن وطن بلوچستان' اس کی مخالف ہے۔ کشمیر کی حمایت یا مخالفت کا رہے سے سوال ہی نہیں اُٹھتا کیونکہ یہ بالکل مہاراجہ کشمیر کی مرضی پر ہے۔ لیکن اگر کشمیر کے مسلمانوں سے استصواب کیا گیا تو یقینی وہ اس تجویز کے حق میں نہ ہوں گے۔ کشمیر کی سب سے بڑی سیاسی جماعت نیشنل کانفرنس اس کے خلاف ہے اور اس جماعت کے عظیم الشان رہنما شیخ محمد عبداللہ کے متعدد بیانات اس تحریک کے خلاف پریس میں آ چکے ہیں۔ بہر حال اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ پنجاب پاکستان کے حق میں ہوگا تو صوبہ سرحد،

سندھ، اور بلوچستان کے تقریباً ۶۰ لاکھ مسلمانوں کے نکل جانے کے بعد پنجاب کے تقریباً سوا کروڑ مسلمان ایک نہایت چھوٹا سا پاکستان بنا سکیں گے۔ جس کی آمدنی اور حیثیت گھٹ کر ایک دیسی ریاست سے زیادہ نہ رہ جائے گی۔

سکھ اور ہندو

"پاکستان" کی سب سے بڑی دستوری پیچیدگی اس میں ۳۱ لاکھ سکھوں اور ۶۳ لاکھ ہندو جاٹوں اور راجپوتوں کی موجودگی ہے، جو اپنے سپاہیانہ جذبے اور سیاسی ضد اور ہٹ میں کسی طرح پنجابی مسلمانوں سے کم نہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پنجاب، سکھوں کا مقدس مقام (HOLY LAND) ہے اور ان کیلئے یہ چیز کبھی قابلِ برداشت نہیں ہو سکتی کہ پنجاب پر کوئی مذہبی حکومت مسلط ہو جائے، جس سے ان کا دھرم "خطرے" میں آسکتا ہو۔ ظاہر ہے کہ اگر ہندو اکثریت کے زیرِ اثر مسلمانوں کا اسلام خطرے میں آتا ہے تو یقینی مسلم اکثریت میں ہندو اور سکھ بھی اپنے مذہب کیلئے خطرہ محسوس کر سکتے ہیں۔ کسی جمہوری نظام میں ایک اقلیت رہ کر تو وہ اپنی قسمت پر شاکر و قانع رہ سکتے ہیں لیکن کسی فرقہ وار حکومت میں غلام بن کر رہنا گوارا نہیں کر سکتے۔

یہی سبب ہے کہ جب سے مسلم لیگ نے پاکستان کی تجویز پاس کی ہے، سارے سکھوں میں ایک آگ سی لگ گئی ہے، اور ایک ایک سکھ اس تجویز کی مخالفت کیلئے اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ سر سکندر حیات خاں، سکھ علاقوں کا برابر دورہ کر رہے ہیں، اور تقریر اور تحریر کے ذریعے سکھوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ایک بہت بڑے سکھ لیڈر، بابا کھڑک سنگھ، جو سکھ گرودوارہ پربندھک کمیٹی کے صدر ہیں، لاہور کے اخبار ٹریبون (مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۴۰ء) کو بیان دیتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"مسٹر جناح کے دو قوموں کے نظریئے پر، جسے مسلم لیگ نے لاہور میں پاس کر دیا ہے، مجھے سخت حیرت ہوئی۔ یہ ساری اسکیم زبردست فتنہ اور شرارتوں سے بھری ہوئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مسٹر جناح یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ جب تک کرۂ دنیا پر ایک سکھ بھی زندہ ہے، وہ ہندوستان کو اس طرح تقسیم نہ ہونے دے گا۔ اگر کوئی پاکستان بننے والا ہے تو وہی سچا پاکستان ہوگا، جب متحدہ ہندوستان، اغیار کی حکومت سے پاک ہوگا۔"

پنجاب اسمبلی کی خالصہ نیشنلسٹ پارٹی نے سر سندر سنگھ مجیٹھیا وزیر لگان پنجاب کی صدارت

میں ۲۹ر مارچ ۱۹۴۰ء کو پاکستان کے خلاف حسب ذیل تجویز پاس کی:۔

"یہ خیال کرنا انتہائی حماقت ہے کہ سکھ ایک دن کیلئے بھی پنجاب میں کسی ایک فرقے کا راج دیکھ سکتے ہیں، جو نہ صرف ہمارا وطن ہے، بلکہ ہمارا مقدس مقام بھی ہے۔ ہندستان کو اس طرح مختلف فرقوں کی آزاد ریاستوں میں تبدیل کرنے کے خلاف سکھ اپنے خون کا آخری قطرہ بہا دیں گے۔

"مسلم لیگ کی اس تجویز کو مدنظر رکھتے ہوئے سکھ اس امر میں بالکل حق بجانب ہوں گے اگر وہ برطانیہ سے مطالبہ کریں کہ وہ سکھوں کو پنجاب کی حکومت واپس کر دے جو مہاراجہ دلیپ سنگھ (مہاراجہ رنجیت سنگھ کے لڑکے) کی صغرسنی کے سبب برطانیہ کو بطور امانت (TRUST) سپرد کی گئی تھی۔"

اسی طرح پنجاب کے سکھ اخبارات نے اس تجویز کے خلاف جہاد بول دیا ہے، اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ اس کے خلاف لکھتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ذیل کا ایک تراشہ بطور نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"کانسٹی ٹیوانٹ اسمبلی میں گاندھی جی اور مولانا آزاد پاکستانی اسکیم کو قبول کر سکتے ہیں، لیکن پنجاب کے (پاکستانی اسکیم کے مطابق) پاکستان بننے سے پہلے سکھ قوم صفحۂ عالم سے اٹھ چکی ہوگی۔ ہم پنجاب میں جمہوریت کے مدعی ہیں۔ کسی فرقہ کی حکومت خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، یا سکھ، ہم ہرگز قبول نہ کریں گے اور پنجاب میں پاکستانی اسکیم کے بارآور ہونے سے پہلے اسے اپنے گرم گرم خون سے لالہ زار بنا دیں گے۔"

(اخبار 'اجیت' امرتسر۔ مورخہ ۱۴ر جولائی ۱۹۴۰ء)

سکھوں کے اسی بے پناہ ایجی ٹیشن سے گھبرا کر مسٹر جناح نے ذیل کا بیان دیا، جس میں آپ نے اپنی عادت کے خلاف بڑے نرم لہجے میں سکھوں کی چاپلوسی اور خوشامد کی ہے۔ آپ نے ۱۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو دہلی سے اخبارات کو یہ بیان دیا:۔

"میں نے ہمیشہ سکھوں کی عزت کی ہے اور ان کا معترف رہا ہوں۔ میں اپنے سکھ دوستوں سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ ہندستان کے موجودہ آئینی سوال کا مطالعہ کریں۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس صورت میں (پاکستان میں) کسی متحدہ حکومت یا واحد مرکزی حکومت کی بہ نسبت کہیں اچھے رہیں گے۔ کیونکہ ہندستان کی ایک واحد مرکزی حکومت میں ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز ہوگی۔ پنجاب ہر حالت میں ایک خود مختار صوبہ اور آزاد عنصر ہوگا، اور انھیں بہر حال پنجاب کے اندر رہنا ہے۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ

ایک متحدہ ہندستان یا کسی واحد مرکزی حکومت کے ماتحت سکھ اپنا کچھ بھی اثر نہ رکھ سکیں گے۔ لیکن مسلمانوں کے قومی وطن (HOMELAND) میں جو اُتّر پچھّم کی آزاد اور خود مختار ریاستوں کا وفاق ہوگا، اور جس میں پنجاب کی آزاد ریاست بھی شامل ہوگی، سکھ ہمیشہ اس میں ایک باعزت پوزیشن کے مالک ہوں گے، اور اس میں شاندار کارنامے انجام دے سکیں گے۔"

غرضیکہ مسٹر جناح سکھوں کو کچھ دے لے کر پاکستان میں رہنے کیلئے راضی کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر سکھ پاکستان میں رہنے کیلئے راضی بھی ہوگئے، تو انھیں ان کے تناسب آبادی سے کہیں زیادہ مراعات دینے پڑینگے۔ اور اسمبلی وزارت اور ملازمتوں میں کافی حصّہ دینا پڑے گا۔ اپنے حقوق کیلئے مول تول کرنے اور جھگڑنے میں سکھ، مسلمانوں سے کچھ کم نہیں۔

سکھوں کے بعد دوسرا ٹیڑھا سوال پنجاب کے ۶۳ لاکھ ہندوؤں کا ہے۔ جو کم و بیش پاکستان کے اتنے ہی مخالف ہیں جتنا سکھ۔ پنجاب کے بیشمار ہندو اخبارات شب و روز پاکستان کے خلاف پروپیگنڈے میں مصروف ہیں۔ اس سلسلے میں پنجاب کے متعدد ہندو لیڈروں کے بیانات نکلے ہیں جنھیں نقل کرنا طول عمل ہے۔ یہاں ہم جاٹوں کے لیڈر، چودہری سر چھوٹو رام، وزیر ڈیولپمنٹ پنجاب کا بیان درج کرتے ہیں جو آپ نے جاٹ مہاسبھا کے اجلاس میں دیا تھا:۔

"دو قوم کے اس نظریئے کے پیچھے اصل مقصد ہندو مسلمانوں کے درمیان خانہ جنگی اور خونریزی کرانے کے سوا کچھ نہیں۔

"میں یقین دلاتا ہوں کہ میرے ساتھی سر سکندر حیات کسی ایسی اسلامی ریاست کا وزیر بننا پسند نہ کریں گے۔

سر سکندر نے بارہا اس امر کا اعلان کیا ہے کہ پنجاب کی حکومت زمینداروں کی ہے، جسے مسلمان، ہندو اور سکھ تینوں نے مل کر قائم کیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار قصور میں جب سر سکندر کو ایڈریس دیتے ہوئے ان کی وزارت کو مسلم لیگی وزارت کہا گیا تو آپ نے فوراً اُٹھ کر کہا۔ "مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میری وزارت جو مخلوط (COALITION) وزارت ہے، اسے مسلم لیگی وزارت کہا جاتا ہے۔" پھر آگے چل کر سر سکندر نے کہا، میں بیس سال سے مسلم لیگ کا ممبر ہوں لیکن اگر آج مجھے معلوم ہوجائے کہ ہمارا مسلم لیگ میں رہنا پنجاب کے زمینداروں کے حق میں مضرت تو مجھے مسلم لیگ سے

استعفےٰ دیدینے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔"

(ہندستان ٹائمز دہلی۔ ۳۰ مارچ ۱۹۴۰ء)

اس کے بعد جاٹ مہا سبھا نے پاکستان کے خلاف ایک تجویز پاس کی، جس میں اس اسکیم کے خلاف لڑنے کے عزم کا اظہار کیا۔ بہر حال ایک صوبے میں ۳۴ لاکھ (۲۷ فیصدی) کی اقلیت کوئی معمولی اقلیت نہیں اور اسے راضی کرنے میں بھی شاید مسلم لیگ کو اتنی ہی دقت ہو جتنی مسلمانوں کو راضی کرنے میں کانگریس کو ہو رہی ہے۔

یہاں یہ خطرہ بھی ہے کہ پنجاب کو پاکستان میں شامل کرنے کے خلاف اگر ہندو اور سکھ مل گئے جو تعداد میں ۹۴ لاکھ ہیں تو پھر پاکستانیوں کیلئے بڑی سخت دقت کا سامنا ہوگا۔ غرضیکہ اس مسئلے کے حل کی دو شکلیں ہیں۔ اوّل تو یہ کہ ان سے جنگ کر کے انھیں فتح کر لیا جائے اور انھیں غلام بنا لیا جائے تاکہ وہ کسی قسم کے حقوق وغیرہ کا مطالبہ نہ کر سکیں۔ اور دوسرے یہ کہ انھیں خاطر خواہ مراعات دیکر پاکستان میں رہنے کیلئے راضی کر لیا جائے۔ لیکن اوّل الذکر صورت میں موجودہ بے سرو سامانی میں ۹۴ لاکھ بہادر سکھوں، جاٹوں اور راجپوتوں کو غلام بنانا ناممکن ہے، اور مؤخر الذکر شکل (پاکستان میں سکھوں اور ہندوؤں کی موجودگی) میں 'اسلامی' اور 'قرآنی' حکومت قائم کرنا محال ہے۔ اِسی طرح "بنگال پاکستان" کے قیام میں بھی سوا دو کروڑ بنگالی ہندو مزاحم ہو سکتے ہیں

مسلم اقلیتیں

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پاکستان اسکیم کو یو۔پی، بہار، سی۔پی، اُڑیسہ، آسام، بمبئی، مدراس اور راجپوتانہ۔ دہلی کے پونے چار کروڑ مسلمان اقلیتوں کی کس حد تک حمایت حاصل ہوگی۔ اب تک اِن صوبوں کے مسلمانوں میں مسلم لیگ کی اس تجویز کی عام مخالفت اس لئے نہیں پائی جاتی کہ وہ سمجھتے ہیں کہ مسلم لیگ تقسیم ہند کی تجویز کو کانگریس کے خلاف دھمکی کے طور پر استعمال کر رہی ہے اور فی الحقیقت ہندستان تقسیم ہونے نہیں جا رہا ہے۔ لیکن جیوں ہی انھیں اِس امر کا یقین ہو جائیگا کہ انھیں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ہندوؤں کی مذہبی اور فرقہ وار حکومت میں رہنا پڑے گا، تو وہ ہرگز پاکستان کے حق میں ووٹ دے کر خودکشی نہ کریں گے۔ کیونکہ پاکستان بن جانے پر تو اقلیت کے صوبے کے مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ موجودہ دستور میں جو مسلمان اقلیتوں کو دونا اور تین گونا ویٹیج ملا ہوا ہے، وہ قائم نہیں رہ سکتا، اور جب کانگریسی وزارتوں کے جمہوری نظام میں مسلمانوں کو شکایات پیدا ہوئیں تو پھر ایک کٹر ہندو راج میں بالقول لیگی حضرات "رام راج" میں، مسلمانوں کے مذہب، کلچر، تمدن اور

مذہبی آثار کا کیا حال ہوگا۔ ہر صوبے میں مسلمان اس قدر بھاری اقلیت میں رہیں گے کہ ان کی کوئی شنوائی بھی نہ ہوگی۔ علاوہ اس کے ہندو، ہندستان فیڈریشن میں ۸۵ فیصدی ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمان ۱۴ فیصدی ہوں گے، جس کے معنی یہ ہیں کہ یہاں بھی ان کی کوئی پرسش نہ ہوگی۔ انھیں صرف اسی اُمید موہوم پر جینا پڑے گا کہ مصیبت کے وقت ان کے پاکستانی بھائی ان کی امداد کرنے آئیں گے، جو پاکستان کے وسائل کو مدِنظر رکھتے ہوئے ناممکن سی بات ہے۔ جو لوگ اس وقت نہتّے ہندوؤں سے خوف زدہ ہو کر پاکستان کے قلعے میں پناہ گزیں ہونا چاہتے ہیں، وہ ایک طاقتور مسلّح ہندو شہنشاہیت سے کس بل بوتے پر ٹکر لیں گے۔ علیحدگی کے بعد پاکستانی اور غیر پاکستانی مسلمانوں کو مطلق ایک دوسرے کی پروا نہ رہیگی۔ جس طرح آجکل افغانستان یا ایران کے معاملات سے ہمیں کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ افغانستان میں حال میں کیسے کیسے انقلابات ہوئے لیکن ہندستانی مسلمانوں نے اخباروں میں اس کی خبریں پڑھنے کے سوا اور کیا دلچسپی لی۔ برما کے فسادات جس میں، غیر برمی ہندستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کو کثرت سے شہید اور تباہ و برباد کیا گیا، ابھی کل کی بات ہے، لیکن حکومت ہند یا مسٹر فضل الحق کی اسلامی حکومت نے ان کا کیا کر لیا۔ ہم نے تو نہیں دیکھا کہ برمی ہندستانیوں کی امداد کیلئے ہندوؤں یا مسلمانوں نے سوائے بیانات چھپوانے کے کچھ کیا ہو۔ اس سلسلے میں مسٹر جینا کا ذیل کا بیان بہت ہی قابلِ غور ہے:۔

> ''اسلامی ریاستوں میں مسلمانوں کی مجموعی آبادی ۶ کروڑ ہوگی۔ اور خود مختار ہندو ریاستوں میں مسلم اقلیت ۳ کروڑ ہوگی۔ لہذا ۶ کروڑ کے فائدے کے مقابلے میں ۳ کروڑ کو قربان ہو جانا چاہیئے''

(از بیان مسٹر محمد علی جناح بسلسلۂ پاکستان)

کانگریس نے تو صرف مسلم اقلیتوں پر ''ظلم'' ہی کیا تھا، لیکن مسٹر جینا تو انھیں قربان ہی کر رہے ہیں۔ بہر حال ہمیں یقین ہے کہ جب پاکستان کے تمام فائدے اور نقصانات مسلم اقلیتوں کے سامنے آجائیں گے تو وہ ہرگز پاکستان کے حق میں ووٹ دیکر اپنے کو دیدہ و دانستہ موت کے منھ میں نہ ڈالیں گے۔

ان حالات میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک طرف سندھ، بلوچستان، بنگال اور صوبہ سرحد نے

پاکستان میں شامل ہونے سے انکار کر دیا، اور دوسری طرف مسلم اقلیتوں نے بھی اس کی حمایت نہ کی، تو مسٹر جینا کس آئینی بنیاد پر مجلسِ آئین ساز میں پاکستان کا مطالبہ پیش کر سکیں گے؟

پاکستان کا دستور

فرض کر لیجئے کہ اگر پاکستان کی تجویز منظور بھی کر لی گئی تو بھی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان کا دستور کیا ہو گا ــــ مذہبی ہو گا یا جمہوری؟ ــ اس سلسلے میں 'پنجابی' صاحب نے جن عزائم اور نظریوں کو پاکستانی حکومت کی بنیاد مانا ہے وہ ذیل کے اقتباسات سے ظاہر ہیں :ـ

"یہاں یہ صاف کر دینا ضروری ہے کہ ہندو، ہندوستان سے ہمارے خطے کی علیحدگی بجائے خود کوئی مقصد نہیں، بلکہ یہ ایک معیاری اسلامی ریاست کے قیام کا ذریعہ ہے۔ مجوزہ علیحدگی بلاشبہ ہمیں ہندوؤں کی اقتصادی غلامی سے نجات دلا دے گی۔ لیکن چونکہ ہمارا مطمح نظر ایک معیاری اسلامی ریاست کا قیام ہے، اسلئے اس کے معنی مکمل آزادی کے بھی ہیں۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد ایک غیر اسلامی دنیا میں ہمارے لئے اپنے اسلامی اسٹیٹ کے بلند نظریوں پر چلنا مشکل ہو گا۔ لہذا ہم اسلامی لائنوں پر ایک عالمگیر انقلاب کی تبلیغ کریں گے۔ الغرض ہمارا مقصد اسلامی اصولوں کی بنیاد پر ایک عالمگیر انقلاب پیدا کرنا ہے۔"

(کانفڈریسی آف انڈیا ـ صفحہ ۲۶۹)

ایک جگہ پاکستان کی شکل و صورت کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں :ـ

"عام طور پر ہندوستان فیڈریشن کے قیام کا تخیل تو مسلمانوں کیلئے بہت زیادہ پسندیدہ ہو گا لیکن ہمیں ڈر ہے کہ اگر ہم اس کے تمام لوازم اور نتائج ان کے سامنے رکھیں تو ممکن ہے اس تخیل میں مسلمانوں کیلئے وہ کشش باقی نہ رہے۔

"یہ بہت زیادہ ممکن ہے کہ مسلم اسٹیٹ کے معنی کسی مغربی طرز کے اسٹیٹ کے نہ ہوں، جس کے ہندوستانی مسلمان عادی ہو چکے ہیں۔ بلکہ اس کے معنی ایک ایسے اسٹیٹ کے ہوں جس کی حکومت اسلامی قوانین کے مطابق، جو قرآن حکیم میں موجود ہیں، چلائی جائے ـ ـ ـ ـ

ـ ـ ـ ـ ـ . . . . . ہو سکتا ہے کہ اس کا مطلب ایک بیت المال کا قیام ہو، جس میں

پابندی کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرنا لازمی ہو۔"

(کانفڈریسی آف انڈیا ۔ صفحہ ۱۹۸)

مسلمانوں کے نقطۂ خیال سے "آزادی" کا کیا مفہوم ہے، اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"مسلمانوں کیلئے آزادی وہی معنی نہیں رکھتی جو کانگریس کے لئے رکھتی ہے۔ کانگریس کیلئے آزادی ایک قومی ضرورت ہے، اور وہ اس کے اسلئے خواہاں ہیں تاکہ قومی خود داری پیدا کریں اور وہ تمام اقتصادی، سماجی اور قومی فوائد حاصل کریں جو اس کے ذریعہ ممکن ہیں۔ (لیکن) مسلمانوں کیلئے "آزادی" ایک مذہبی ضرورت ہے، تاکہ اس کے وسیلے سے وہ تمام دینی و دنیوی فوائد حاصل کئے جائیں جن کا اسلام ضامن ہے۔ مسلمان اپنے مذہبی اور ثقافتی نظریوں کو بروئے کار لانے ہی کیلئے آزادی کے خواہاں ہیں، کیونکہ یہ نظریئے ایک غیر ملکی حکومت کے زیر اثر نہیں پنپ سکتے۔ ایک غیر ملکی حکومت میں یا ایسے اسٹیٹ میں بھی جو غیر مسلم فرقوں کی مشارکت سے قائم کیا جائے، مسلمانوں کا اسلامی تشخص، جس پر حصولِ جنت کا دار و مدار ہے، پھل پھول نہیں سکتا، کیونکہ اس میں اس کے اظہار کے مواقع نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صرف اسلامی ریاست ہی ایسی ہو سکتی ہے (جس میں یہ تمام مواقع حاصل ہوں)۔"

(" ۔ صفحہ ۹۸)

پاکستان کی اقتصادیات کس نمونے کی ہوگی، اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:۔

"اسلام کے معیشی اداروں سے وہی نتائج مرتب ہوں گے، جو اشتراکیت (سوشلزم) کے ذریعہ ممکن ہے۔ سود خوری نہ ہونے کے سبب بینک کا سرمایہ کبھی نہ ہوگا۔ مسلم قانونِ وراثت شخصی جائداد کو چند ہی پشتوں میں متعدد حصوں میں تقسیم کر دے گا اور اسٹیٹ کے منظم شدہ زکوٰۃ کے یہ معنی ہوں گے کہ تیس[۳۰] چالیس[۴۰] سال میں ایک شخص کی آمدنی کا فاضل حصہ اسٹیٹ کو منتقل ہو جائے گا۔"

(" ۔ صفحہ ۹۹)

مندرجہ بالا اقتباسات سے ناظرین کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ محرکین پاکستان کے ذہن میں

کس طرز کا اسٹیٹ ہے اور اس کے خط و خال کیا ہوں گے۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم 'پنجابی' صاحب کے مندرجہ بالا نظریات کا مطالعہ کریں، تحریک پاکستان کے فلسفی اور مبلّغ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے نظریے کا اِعادہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ آپ نے 'اسلامستان' کی تحریک شروع کی ہے، اور اس کیلئے ایک جماعت کی تشکیل بھی کر رہے ہیں۔ آپ کے 'اسلامستان' کی خصوصیات کیا ہوں گی، اس کا اندازہ ذیل کی تحریر سے ہوگا:۔

(۱) "امیر کا انتخاب قرآن کریم کے اِس اصول کی بنا پر ہوگا — "تم میں سب سے بہتر وہی ہے جس کے دل میں خدا کا سب سے زیادہ ڈر ہے" مطلب یہ ہے کہ اس عہدے کیلئے اُسی شخص کا انتخاب عمل میں آئیگا جسے عام مسلمان اپنی جماعت میں سب سے بہتر سمجھتے ہوں۔ انتخاب کے بعد امیر کو تمام قسم کے مکمل اختیارات حاصل ہوں گے۔ اور اس پر کامل اعتماد کیا جائے گا۔ جب تک وہ احکام الٰہی اور سنّتِ رسول پر عامل رہے گا اُسے مسلمانوں کی کامل اطاعت حاصل ہوگی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(۳) امیر ایک مشاورتی کانسل کی مدد سے کام کرے گا۔ کانسل کے لئے عامۃ المسلمین کا اعتماد حاصل کرنا ضروری ہوگا۔ اور اگر اس کانسل کے ممبروں کا انتخاب عام مسلمانوں کے ووٹ سے ہو، تو یہ اسلامی قوانین کے خلاف نہیں، حالانکہ پہلے چار خلفاء کے عہد میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

(۴) عام طور پر کانسل اپنا فیصلہ اکثریت کے ووٹ سے کرے گی۔ لیکن اسلام، صرف کثرتِ تعداد کی بنا پر کسی شے کو 'حق' تسلیم نہیں کرتا۔ اسلامی اُصول کے مطابق یہ ممکن ہے کہ کسی ایک فردِ بشر کی رائے پوری مجلس سے زیادہ صائب اور مبنی برحق ہو۔ اگر ایسے حالات پیدا ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ 'حق' کو اسلئے نظر انداز کر دیا جائے کہ وہ اقلیت میں ہے، اور 'ناحق' کو اسلئے تسلیم کر لیا جائے کہ اس کے پیچھے ایک بھیڑ ہے۔ لہٰذا امیر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اقلیت کا ساتھ دے یا اکثریت کا طرفدار ہو۔ نہ صرف یہ، بلکہ ممکن ہے کہ وہ پوری کانسل کی رائے سے اختلاف رکھتا ہو اور صرف اپنے ذاتی قوتِ فیصلہ سے فیصلہ صادر کرے۔

(۵) کوئی ایسا شخص، جو امارت یا اسٹیٹ کے کسی دوسرے عہدے کا خواہاں ہوگا وہ اس عہدے کیلئے ناقابل قرار دیا جائیگا۔ اسلام میں امیدواری اور الیکشن پروپیگنڈا کے قسم کی کوئی چیز موجود نہیں۔

رسول اللہ نے اس امر کی صاف صاف ہدایت فرمائی ہے کہ اس شخص کو عہدہ نہ دینا چاہئے، جو اس کا خواہاں ہو۔ ایک سچا مسلمان اس تخئیل ہی سے کانپ اُٹھتا ہے کہ کسی ایک عہدے کیلئے دو تین یا چار اُمیدوار اُٹھ کھڑے ہوں، اور ایک دوسرے کے خلاف پمفلٹ بازی، پارٹی بازی اور اخباروں میں پروپگنڈا کیا جائے اور ووٹروں پر اثر ڈالا جائے - - - - - - - یہ شیطانی جمہوریت کے مبتذل طریقے ہیں۔ اگر کوئی شخص اسلامی اسٹیٹ میں اس قسم کی کارروائیاں کریگا یا اس میں شامل ہوگا تو اس کے خلاف قاضی کی عدالت میں قانونی کارروائی کی جائیگی۔

(۶) مجلس مشاورت میں پارٹیاں بنانے کی اجازت نہیں۔ ہر شخص خود اپنی رائے قائم کرےگا، اور اس کے مطابق ووٹ دےگا"

("اسلامک کانسٹیشن آف اسٹیٹ"۔ مصنفہ ابوالاعلیٰ مودودی صفحہ ۳۰")

غرضیکہ محرکینِ پاکستان کے مطابق، تحریکِ پاکستان کا مقصد ایک اسلامی ریاست کا قیام ہے، تاکہ اس کے ذریعہ دنیا میں اسلامی لائن پر ایک عالمگیر انقلاب پیدا کیا جائے۔ اور خلافت یا امارت کا دوبارہ احیاء کیا جائے۔

لیکن پنجابی، صاحب نے یہ بتلانے کی زحمت نہ فرمائی کہ آخر اس ریاست کا دستور کیا ہوگا۔ آیا یہ کوئی مذہبی طرز کی خلافت یا امارت وغیرہ ہوگی یا جمہوری قسم کی پارلیمنٹری حکومت ہوگی۔ اسلامستان کے بانی مولانا مودودی اس معاملے میں زیادہ صاف ہیں، اور انھوں نے 'اسلامستان' کی اسلامی حکومت 'امیر' اس کی کانسل، اور طرزِ انتخاب وغیرہ بالتفصیل بتلایا ہے۔

بہرحال پنجابی صاحب کے بیانات سے یہ چیز صاف ہوجاتی ہے کہ یہ ریاست اسلامی قوانین اور قرآنی احکام کی روشنی میں چلائی جائے گی، جس میں سود لینا اور دینا دونوں ناجائز ہوگا، بینک قائم کرنا جرم ہوگا۔ حکومت کا ایک بیت المال ہوگا اور ہر مسلمان کو ڈھائی روپیہ سیکڑہ زکوٰۃ نکالنا ہوگا جسے اسٹیٹ کے بیت المال میں جمع کیا جائیگا، اتنا ہی نہیں، اگر حامیانِ پاکستان، 'اسلامی قوانین' اور قرآنی احکام کے فقرے نیک نیتی سے کہتے ہیں تو اس کے معنے یہ بھی ہوتے ہیں کہ پاکستان میں جرائم کیلئے حدِ شرعی

جاری ہوگی اور جرائم کی سزا جیل کے عوض دُرّوں سے دی جائیگی ـــــ زانی مرد اور زانی عورت کو سو سو دُرّے لگائے جائیں گے یا شادی شدہ زانیوں کو سنگسار کیا جائیگا۔ مرتد کا قتل ہوگا، چور کے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں گے، تمام مسکرات و منشیات کا استعمال جرم قرار دیا جائیگا، مصوری، فوٹوگرافی اور سینما وغیرہ ممنوع قرار دیدئے جائیں گے وغیرہ وغیرہ۔ پنجابی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمانوں نے گذشتہ صدیوں میں اپنے قریبی روابط کے سبب ہندستان کے دوسرے فرقوں سے جو اثرات قبول کئے ہیں، انھیں ان اثرات سے پاک کردیا جائیگا (صفحہ ۱۹۸) اس کا مطلب شاید یہ ہے کہ مسلمانوں کیلئے داڑھی منڈوانا، دھوتی باندھنا، عورتوں کیلئے ساری پہننا، بے پردہ چلنا پھرنا، ہندی لکھنا پڑھنا، شادی بیاہ میں ہندوانہ رسوم کی پابندی کرنا وغیرہ جرم قرار دیدی جائیگی۔

لیکن آپ نے یہ نہ بتایا کہ پاکستان کے ۳۸ فی صدی ہندوؤں اور سکھوں کا کیا ہوگا ـــ آیا انھیں کاروبارِ حکومت میں شریک رکھا جائیگا یا انھیں غلام بنا کر ان سے جزیہ وصول کیا جائیگا۔ پھر کشمیر، کپورتھلہ وغیرہ کی ہندو اور سکھ ریاستیں اس قرآنی حکومت میں، کس طرح شریک کی جائیں گی؟ یہ بھی کہیں بتلایا نہیں گیا۔

بہرحال سوال یہ ہے کہ حامیانِ پاکستان، جس اسلامی حکومت کا خواب دیکھ رہے ہیں، وہ اس کرۂ زمین کے کسی حصے میں موجود بھی ہے یا نہیں؟ وہ ممالک جہاں مسلمانوں کی آزاد اور خودمختار سلطنتیں ہیں وہاں بھی اسلامی قوانین اور قرآنی احکام نہیں چل رہے ہیں۔ موجودہ دور میں دنیا میں سلطنتیں مذہبی بنیادوں پر قایم نہیں۔ موجودہ دنیا میں اقتصادیات کا مذہبی نظام چل بھی نہیں سکتا، اور نہ دنیا کی کوئی قوم امیر یا خلیفہ کی وہ غیر جمہوری ڈکٹیٹریت تسلیم کرسکتی ہے، جس کا ذکر مولانا مودودی نے کیا ہے۔ تین تین سو برس ہوئے، یورپ نے مذہبی حکومتوں کا خاتمہ کرکے خالصتاً سیاسی اور قومی حکومتیں بنائیں۔ عالمِ اسلام کا رہنما ترکی نے مٹتے مٹتے یہ سبق سیکھا کہ موجودہ دنیا میں مذہبی حکومتیں نہیں چل سکتیں اور اس قسم کی حکومت قائم کرنا تباہی و بربادی کو دعوت دینا ہے۔ چنانچہ ترکی نے زمانہ ہوا خلافتِ اسلامیہ کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خیرباد کہدیا اور اس کی جگہ قومی و جمہوری حکومت قائم کی۔ دنیا کی دوسری آزاد مسلم سلطنتیں جیسے ایران، افغانستان، عراق، عرب یا مصر میں کہیں بھی صحیح معنوں میں اسلامی حکومت نہیں ہے۔

افغانستان، عراق اور عرب میں شخصی اور خاندانی بادشاہت ہے۔ گرچہ ان ممالک میں بھی جمہوری ادارے قائم ہوتے جارہے ہیں۔ ایران میں جرمنی یا اطالیہ کی قسم کی ڈکٹیٹر شپ ہے، مصر میں برطانی ٹائپ کی پارلیمنٹری حکومت ہے۔ نہ صرف ان ملکوں کی حکومت بلکہ ان کے قوانین اور اقتصادی زندگی بھی 'اسلامی' نہیں۔ سوائے قانونِ وراثت اور خلع و طلاق کے تمام قوانین رومن قوانین (ROMAN LAW) وغیرہ سے لئے گئے ہیں۔ بلکہ ترکی میں تو قانونِ وراثت بھی اسلامی نہیں، سوئٹزرلینڈ سے لئے گئے ہیں۔ مثلاً ترکی میں اب باپ کی جائداد میں بیٹی اور بیٹے دونوں کا حق مساوی قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ اسلام میں بیٹی کا حق بیٹے سے نصف رکھا گیا ہے۔ ترکی نے (بقول 'پنجابی' صاحب) "جرمنی سے تجارتی قوانین اخذ کئے ہیں، اطالیہ سے تعزیری اور دیوانی و وراثت کے قوانین سوئٹزرلینڈ سے لئے ہیں۔" (صفحہ ۱۹۹)

تمام اسلامی ممالک میں ان کے اپنے بینک ہیں، اور کل اقتصادی کاروبار سودی لین دین کی بنا پر چلتے ہیں۔ اخلاقی جرائم کیلئے ان تمام آزاد اسلامی ممالک میں کہیں بھی حدِ شرع جاری نہیں کی جاتی۔ لوگوں کے اداب و معاشرت میں بھی نمایاں تبدیلی ہو رہی ہے۔ ترکی اور مصر میں تو رسم پردہ بالکل اُٹھ ہی گئی۔ اب ایران، عرب، عراق اور افغانستان بھی اسی نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔ جو لوگ ان اسلامی ممالک کے حالات کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ کس طرح تیزی سے یورپین تہذیب و تمدن اختیار کرتے جارہے ہیں، اور کسی اسلامی ملک میں اس امر کی کوئی جدوجہد یا تحریک موجود نہیں جس کا مقصد اس ملک میں اسلامی حکومت کا قیام ہو۔

غرضیکہ دنیا میں ایک 'اسلامی حکومت' قائم کرنے کی سعادت شاید لوحِ محفوظ میں پنجاب ہی کے چند مسلمانوں کے نام لکھی ہوئی ہے، جو فی الحال حکومتِ برطانیہ کے غلام ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب آزاد مسلم ممالک مذہبی حکومتیں قائم کرنے میں ناکام رہے تو ایک غلام ملک کس طرح اس کوشش میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس اعلیٰ مقصد کے حصول کیلئے تو پاکستانیوں کو لازم ہے کہ سب سے پہلے انگریزوں سے جنگ کر کے شمالی و مغربی صوبوں کو آزاد کرائیں۔ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے ایک تجویز پاس کر دینے سے تو کام نہیں چل سکتا۔ وہ آزادی جس میں ایک آزاد اسلامی حکومت قائم کی جا سکے، مطالبات سے نہیں، بلکہ قربانیوں سے مل سکتی ہے۔

پاکستان اور حکومتِ برطانیہ

بہر حال ہمیں یہاں اس امر کا مطالعہ کرنا ضروری ہے کہ محرکین پاکستان کا برطانی حکومت سے متعلق کیا رخ اور رویہ ہے۔ کیونکہ حکومت اسلامیہ کے قیام کی جد وجہد کی پہلی ٹکر تو برطانی سامراج سے ہونی چاہیئے۔ جب تک ہم اس پہلو پر غور نہ کرلیں کہ پاکستان برطانی اثرات سے آزاد ہوگا یا نہیں۔ ہم حکومت پاکستان کی ہئیت و نوعیت اور اس کے حیطۂ اقتدار و اختیارات کے متعلق کوئی فیصلہ کن نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔ "کانفڈریسی آف انڈیا" میں اس سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اُس سے جستہ جستہ عبارتیں ذیل میں نقل کرتا ہوں۔

"مسلمانوں کے مذہبی مفاد" کے تحت لکھتے ہیں:—

جہاں تک مسلمانوں کے مذہبی مفاد کا تعلق ہے، ہمیں یہاں کسی طویل مباحثے میں پڑنے کی ضرورت نہیں، جس میں ہمیں مسلمانوں کے عہدِ حکومت یا اسکے استیصال کے بعد مسلمانوں کی مذہبی تاریخ کا جائزہ لینا پڑے۔ یہاں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ برطانی عہد حکومت میں، جہاں تک مذہبی رسومات، عقائد اور عمل کا سوال تھا، مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل رہی۔"

(صفحہ ۱۱۹)

لیجئے یہ تسلیم کرلیا گیا کہ انگریزوں کی حکومت میں، مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل رہی۔ اب اور کیا چاہیئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستانیوں کو انگریزوں کی طرف سے مذہب میں رخنہ اندازی کا کوئی کھٹکا نہیں۔ اور جو کچھ خطرہ ہے وہ ہندوؤں سے ہے۔ آگے چل کر اس امر پر اظہارِ تاسف کیا گیا ہے کہ انگریز اب مسلمانوں کی محافظت سے لاچار ہیں:—

"یتیموں کی حالت قابل رحم ہوتی ہے۔ لیکن ان حالات (یعنی زندگی کے ہر شعبے میں ہندوؤں کا مسلمانوں کو تنگ کرنا) کے باوجود ہندو، مسلمانوں پر طعنہ زن ہوتے ہیں کہ تم غیر ملکیوں کا سہارا ڈھونڈتے ہو۔ اگر انگریز ہماری حفاظت کرسکیں تو ہم ان کے شکر گزار ہوں گے لیکن ستم تو یہ ہے کہ ہندوؤں کے بڑھتے ہوئے مظالم کے سامنے انگریزوں کی محافظت کارگر ہوسکے گی۔"

(صفحہ ۱۳۵)

مطلب یہ ہے کہ ہندستان کے ۸ کروڑ فرزندانِ توحید یتیم بچّے کی طرح کمزور ولاچار اور بیکس و بے نوا ہیں، جسے ہندو، ایک طاقتور دیو کی طرح چٹ کر جانا چاہتا ہے، اس بچّے کے سر پر ہاتھ رکھنے والا اگر کوئی ہے تو وہ انگریز ہیں، لیکن اس قوی ہیکل دیو کے سامنے اس بڈی انگریز کی بھی کچھ چل بن نہیں سکتی۔ اگر انگریز حفاظت کر سکتا تو یہ یتیم بچّہ ہمیشہ اسی کا دامن پکڑے ہوئے زندگی گذار دیتا۔ پنجابی صاحب زندہ باد اسلامی خودداری اور شجاعت و مردانگی کی مثال اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے اور اسلام کو اغیار کے سامنے اس سے زیادہ کیا سربلند کیا جا سکتا ہے۔

اس امر کا جائزہ لیتے ہوئے کہ پاکستان کی تجویز سے متعلق برطانیہ کا کیا رویہ ہوگا، اور اگر مسلمانوں نے کانگریس کا ساتھ دیا اور انگریز ہندستان سے چلے گئے تو مسلمانوں کو ان کا جائز حق مل سکے گا یا نہیں، پنجابی صاحب اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:-

"(۱) علحدگی کا مطالبہ فوراً شروع کر دینا چاہئے۔

(۲) برطانیہ کی ہندستان میں موجودگی کے زمانے ہی میں علحدگی ہونا چاہئے۔

- - - - - - - - - - - - - - - - - -

(۴) انگریز اپنے دُور رس مفاد کے مدِّنظر اس تجویز کی تائید کریں گے۔ کیونکہ ان کے مفاد اس امر کے متقاضی ہیں کہ وہ ہندستان کو اپنے قبضے میں رکھیں۔ خواہ ایک واحد ملک کی صورت میں یا دو ملکوں کی صورت میں"

(کانفڈریسی آف انڈیا۔ صفحہ ۱۷۹)

ملاحظہ ہو، کس طرح ہندستان کو انگریزوں کی دائمی غلامی میں رکھنے کی سازش ہو رہی ہے یہ تو اب ایک مسلم حقیقت ہے کہ انگریز ہندستان کو "ایک" ملک کی صورت میں غلام نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے دو یا تین ملک بنا دینا چاہئے، تاکہ ان کا سایۂ عاطفت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم رہے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں یہ تحریک ہندستان میں دو آلسٹر (بنگال و پنجاب) بنانے کی پیش کش ہے۔ پاکستانیوں کو بجا طور پر انگریزوں سے حمایت کی اُمید رکھنی چاہئے، کیونکہ اس میں سراسر انہی کا فائدہ ہے۔ اور ہندستان کے تقسیم ہو جانے کے بعد ان کی حکومت کو ایک ابدی اجارہ مل سکتا ہے۔ اس وقت تمامی ہندستان

کا اتحاد ہی ہے جو اُن کی آنکھ میں کانٹا بنا ہوا ہے۔ ورنہ اگر ہندستان دوبارہ (زوالِ مغلیہ کے زمانے کی طرح) مرہٹہ، راجپوت، حیدرآباد، بنگال اور پنجاب کی ریاستوں میں تقسیم ہو گیا تو ان کے لئے پیشوا، نظام، ٹیپو، رنجیت سنگھ، یا سراج الدولہ کو بلا لینا یا انھیں شکست دیدینا کون سی مشکل بات ہوگی۔

بہرکیف مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ ظاہر ہو گیا ہوگا کہ یہ حضرات برطانیہ کی موجودگی اور اس کے سایۂ عاطفت میں اس اسکیم کو بروئے کار لانا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں دو مزید اقتباسات ملاحظہ فرمالیں تاکہ پاکستان کی آزادی اور "اسلامی حکومت" کا صحیح تصور آپ کے ذہن میں آجائے۔

کانفڈریسی کے قیام کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:۔

"مندرجہ بالا طریقے پر ہندستان کی ایک کانفڈریسی بنانے کے بعد ہر فیڈریشن جو اس میں شامل ہوگا اس کے اندر ایک گورنر جنرل اور اس کی صوبائی وحدتوں کے لئے ایک ایک گورنر ہوں گے، جو کانفڈریسی کے آگے صیغہ جاتِ احدیہ، ریاستوں کے معاملات اور تاج کی ذمہ داریوں کے لئے جوابدہ ہوں گے۔ کانفڈرل حاکم وائسرائے اور ان کی ایک اسمبلی ہوگی"

(صفحہ ۱۲)

ظاہر ہے کہ یہ گورنر، گورنر جنرل اور وائسرائے کسی امیر المومنین یا خلیفہ کے نہیں بلکہ حضور انگریز بہادر کے ہوں گے، اور تاج کی ذمہ داریوں کے معنی ہندستان میں انگریزوں کے مفاد کی نگرانی کے ہوں گے۔ آل انڈیا کانفڈریسی کے حاکم حضور ملک معظم کے ایک وائسرائے ہوں گے۔ جن کی ماتحتی میں مسٹر جینا کا اسلامستان اور مالوی جی کا کفرستان سبھی ہوگا۔

یہ ہے پاکستانیوں کی 'اسلامی' اور 'قرآنی حکومت' کا نقشہ۔ بھلا سفید فام نصرانیوں سے بڑھکر 'اسلامی حکومت' کو چلانے کا کون اہل ہو سکتا ہے، اور انگریزوں سے بڑھکر اسلام کو کون سمجھ سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس سے بڑا فریب شاید اس آسمان کے نیچے کبھی کسی قوم کو دیا گیا ہو۔

مسلم لیگ کی لاہور کی تجویز (بسلسلۂ پاکستان) میں مندرجہ ذیل فقرہ

بھی آیا ہے:-

"دستور میں اقلیتوں کیلئے مؤثر احکامی تحفظات (MANDATORY SAFEGUARDS) ہوں گے تاکہ اُن مقامات کی اقلیتوں کے مذہب، کلچر، اور سیاسی و اقتصادی حقوق کی کما حقہ حفاظت ہو سکے۔"

یعنی ہندو اور مسلم اقلیتوں کے حقوق کی محافظت کیلئے یہ احکامی تحفظات نافذ کرنے اور منوانے والی طاقت سوائے برطانیہ کے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اسلام اور اسلامی کلچر کا محافظ انگریز نصاریٰ سے بڑھکر اور کون ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں مسٹر جناح نے ایک بیان دیکر پاکستان کے سیاسی درجے کی مزید وضاحت کردی ہے۔ دہلی سے ۳۱ مارچ ۱۹۴۰ء کو جو بیان آپ نے دیا تھا، اُس میں فرماتے ہیں:-

"پاکستان کے علاوہ ہندوستان میں جو دوسرے ریاستی حلقے بنیں گے اُن سے ہمارے تعلقات بین الاقوامی ڈھنگ کے ہوں گے۔ اس کی مثال ہندوستان کے برما اور سیلون سے موجودہ تعلقات میں موجود ہے۔"

غرضیکہ پاکستان کی حیثیت برما یا سیلون جیسی ہوگی۔ 'پنجابی' صاحب نے بھی اپنی تصنیف میں متعدد مقامات پر پاکستان کی مثال برما سے دی ہے، اور یہ ثابت کرنے کیلئے کہ برما اور ہندوستان کا معاملہ ایک سا ہے پورا ایک باب (باب پنجم از صفحہ ۲۳۱ تا ۲۴۱) صرف کردیا ہے۔

مذہب کے نام پر فریب

بہر حال ان شواہد کے مطالعہ سے ہم سوائے اس کے اور کسی دوسرے نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے کہ محرکینِ پاکستان کے پیشِ نظر کوئی اسلامی یا قرآنی حکومت نہیں بلکہ حکومتِ برطانیہ کے زیرِ سایہ برما یا سیلون جیسی کوئی ریاست ہے۔ علاوہ ازیں پاکستان میں ۴۷ فیصدی ہندوؤں اور سکھوں کا موجود رہنا بھی اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ حکومتِ پاکستان کی شکل و صورت موجودہ صوبجاتی خود مختاری (PROVINCIAL AUTONOMY) سے کچھ مختلف نہ ہوگی۔ ظاہر ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں ہندو یا سکھ کس طرح شامل ہو سکتے ہیں۔ پھر کشمیر، کپورتھلہ وغیرہ کی ہندو ریاستیں بھی کسی اسلامی حکومت کا جزو نہیں بن سکتیں۔ غرضیکہ تمام

کاروبارِ حکومت وہی ہوگا جو اب ہے یعنی اسی طرح پارٹیاں بنیں گی، انتخابات لڑے جائیں گے۔ اکثریت رکھنے والی جماعت کی حکومت ہوگی، کابینے میں ہندوؤں اور سکھوں کی نمایندگی ہوگی۔ ان کے کاموں کی نگرانی کیلئے ایک گورنر ہوگا، اور جس طرح آج پنجاب کے مسلمان، ہندو اور سکھ مل کر حکومت چلاتے ہیں ویسے ہی اُس وقت بھی چلائیں گے۔ یہ دستور قرآنِ حکیم کا بنا ہوا نہیں بلکہ وائٹ ہال کا نازل کردہ ہوگا، اور ایک جدید اسٹیٹ کے جتنے لوازم ہیں، وہ سب اس میں موجود ہوں گے۔ بینک کے سودی اور غیر اسلامی کاروبار ہی پر تمام اسٹیٹ کی زراعت، صنعت و تجارت کا دار و مدار ہوگا۔ حکومت کی بنیاد مذہب نہیں بلکہ طبقاتی مفاد ہوں گے جن کی بنا پر ہندو، مسلمان، یا سکھوں کی پارٹیاں نہیں، بلکہ ہندو، مسلم، سکھ کسان اور زمینداروں کی مشترک پارٹیاں ہوں گی، جو حکومت پر اقتدار حاصل کرنے کیلئے آپس میں برسرِ پیکار رہیں گی۔ غرضیکہ تمام لوازمات وہی ہوں گے جو اب ہیں ۔۔ فرق صرف اس قدر ہوگا کہ آج اگر پنجاب اسمبلی میں ۴۲ ہندو اور ۳۱ سکھ بیٹھتے ہیں تو اُس وقت اس سے کچھ کم بیٹھیں گے۔ حکومت کی ہئیت بہرحال مشترکہ رہے گی، کسی ایک فرقے کی نہ ہوگی۔ پاکستان کی قطع بالکل یو۔ پی جیسی ہوگی۔ جس طرح یو۔ پی کے ۱۴ فیصدی مسلمان کاروبارِ حکومت کے ہر شعبے میں شریک ہیں، اسی طرح پاکستان کے ۴۲ فیصدی ہندو اور سکھ اس حکومت کے ہر نظم و نسق میں شریک ہوں گے۔

بہرحال اگر مسلم لیگ والوں کا مقصد ترکی یا ایران جیسی آزاد خودمختار حکومت قائم کرنا نہیں، تو پھر ایک آزاد اور خودمختار اسلامی حکومت کا ڈھول پیٹنے سے کیا فائدہ، اور مسلم عوام کو قرآنی احکام و قوانین کا سبز باغ دکھانے سے کیا حاصل؟ عوام اور اپنے ضمیر کو دھوکہ دینے کے عوض کیوں نہیں صاف صاف کہہ دیتے کہ ہندستان میں ایک دوسرا 'فلسطین' بنایا جا رہا ہے۔

لیکن جن لوگوں کو مذہب کا نام لیکر دھوکہ دینے کی عادت ہو گئی ہو، وہ اس سے کس طرح باز آسکتے ہیں۔ اور اس صورت میں جبکہ وہ دیکھتے ہیں کہ مسلم عوام پر یہی مذہب کا نعرہ سب سے زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ دنیا میں گذشتہ ایک ہزار برس میں جتنے فتنے اُٹھے ہیں وہ اسی نام پر اُٹھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اِن تمام بے راہ رویوں کا سبب یہ خودغرض لیڈر نہیں، بلکہ مسلم عوام کی زود یقینی ہے، جو ہر اُس چیز کو ماننے کیلئے تیار بیٹھی ہے، جو اُسے مذہب کا نام لیکر بتایا جائے۔ بس مسلم لیگ نے

کہہ دیا کہ اسلامی حکومت کے قیام کیلئے پاکستان کی ضرورت ہے، اور مسلمان بھی بغیر یہ سوچے سمجھے کہ موجودہ دنیا میں اس طرح کی حکومت کا قیام حدِ امکان میں ہے بھی یا نہیں، پاکستان، 'پاکستان' چیخنے لگے۔ موجودہ دنیا میں اس طرز کی اسلامی حکومت تو کہیں موجود نہیں، جو حامیانِ پاکستان پیش کرتے ہیں، اور نہ ایسی 'معیاری اسلامی ریاست' خلفائے راشدین کے عہد کے بعد کبھی بن سکی۔ لیکن اگر کسی قوم کا تاریخی احساس (HISTORICAL SENSE) اس درجہ مبتذل ہو گیا ہو کہ وہ اپنے آگے پیچھے دیکھتی ہی نہیں، تو اس کیلئے قدرت کے پاس سوائے بربادی کے اور کیا فیصلہ ہو سکتا ہے۔
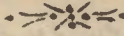
صحیح لائحہ عمل

پچھلے صفحات میں پاکستان کے تقریباً تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاچکی ہے اور قارئین ملاحظہ کر چکے ہیں، کہ اس اسکیم کے خواہ کسی پہلو کا مطالعہ کیا جائے، یہ ہر لحاظ سے نہایت لغو، لچر اور نقایص سے پُر ہے۔ لیکن جہاں تک بنگال مسلم فیڈریشن کا تعلق ہے، وہ تو پاکستان سے بھی گیا گذرا ہے۔ پاکستان کو کم از کم اتنا تو سہارا ہے کہ اس کے پڑوس میں ایران اور افغانستان کی مسلم سلطنتیں ہیں، اور ملکی دفاع کیلئے اسے بہادر اور پیشہ ور سپاہیوں کی کبھی کمی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ پنجاب اور سرحد میں پٹھان، سکھ اور جاٹ جیسی جنگجو قومیں آباد ہیں۔ لیکن بنگال تو ہر چہار طرف سے غیر مسلم حلقوں سے گھرا ہوا ہے۔ اور اپنے دفاع کے لئے نہ اس کے پاس سامان ہے اور نہ سپاہی۔ بردوان اور پریسیڈنسی ڈویژن نکل جانے سے بنگال کا معدنی اور صنعتی حصہ ہندو علاقے میں چلا جاتا ہے، اور اس کے بعد مشرقی بنگال کے مسلمانوں کے پاس سوائے چاول پیدا کرنے اور مچھلی مارنے کے کوئی دوسرا ذریعہ معاش ہی نہیں رہ جاتا۔ پھر جاپان کے ایسٹ انڈیز تک آجانے سے بنگال کے ساحل کیلئے مستقل خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ پاکستان اور بنگال ایک دوسرے سے اس قدر دور ہوگا کہ وہ کسی نازک موقع پر ایک دوسرے کی مدد بھی نہ کر سکیں گے۔ یہ دونوں پاکستان ہندستان کے دو کونوں پر ایک دوسرے سے ڈیڑھ ہزار میل کے فاصلے پر ہوں گے۔ جس کے درمیان ایک لق و دق ہندو آبادی ہوگی۔ ان دونوں پاکستانوں کو ملحق کرنے کے لئے یقینی پندرہ سو میل کی ایک گلی (CORRIDOR) بنانی پڑے گی۔ کیا عجب ہے کہ بنگال کی علیحدگی کے بعد پھر یورپ کی کوئی حوصلہ مند قوم یا خود جاپان ہی بنگال پر حملہ کرے، ایک پلاسی کی لڑائی ہو، میر جعفر پیدا ہوں (کیونکہ بنگال میں میر جعفروں کی کمی نہیں) اور ہندستان کی غلامی کا ڈرامہ پھر سے کھیلا جائے۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ علیحدگی کے بعد بنگال کا یہ حصہ ایک دیسی ریاست کی حیثیت کا رہ جائے گا اور اس کے وسائل اتنے محدود ہو جائیں گے کہ وہ آزاد ہندستان یا جاپان جیسی طاقتوں کا دو چار دن بھی مقابلہ نہ کر سکے گا۔

بہر حال قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس اسکیم نے ملک کا کون سا مسئلہ

حل کیا۔ مسلم اقلیتوں کا مسئلہ علیٰ حالہ قائم رہ جاتا ہے، جو اس اسکیم کی نااہلیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ گذشتہ تین برسوں میں اگر مسلم لیگ نے کوئی کام کیا ہے تو وہ یہی کہ کانگریسی صوبوں کی مسلم اقلیتوں کی مظلومیت کا ڈھول پیٹا ہے۔ لیکن پاکستان ہونے کے بعد نہ صرف ان کی 'مظلومیت' برقرار رہتی ہے، بلکہ انھیں ایک مکمل مذہبی ہندو راج کے ماتحت مظالم سہنے کیلئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اگر موجودہ صورت میں ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ کانگریسی حکومت میں یو۔پی، بہار، سی۔پی، بمبئی، مدراس اور اڑلیسہ کے مسلمانوں کا مذہب، کلچر، زبان، عبادت خانے اور گاؤ کشی کے حقوق محفوظ نہیں اور ان پر ہندوؤں کا حملہ ہوتا ہے تو کیا ہندو، ہندستان کی خالصتاً ہندو حکومت میں جسے پاکستانی حضرات ہندو تہذیب و تمدن کے احیا کا حق بھی دیدیتے ہیں،[1] مسلمانوں کی یہ تمام عزیز ترین چیزوں کے مٹ جانے کا امکان نہیں؟ لطف تو یہ ہے کہ آپ اسلامی کلچر کی محافظت کے لئے کمر بستہ ہوتے ہیں لیکن جو فی الواقعی مسلم تمدن و تہذیب کے حلقے ہیں اور اُردو زبان کے مرکز ہیں انھیں ہندوؤں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اسلامی تہذیب کا نقش اور اس کے آثار سب سے زیادہ یو۔پی اور دہلی میں پائے جاتے ہیں۔ یو۔پی اور دہلی کی تہذیب پر مسلمانوں کا گہرا نقش ہے۔ اگر ہندستان میں کہیں مسلم تہذیب کا اثر غالب ہے تو وہ یو۔پی اور دہلی میں ہے۔ ان مقامات پر مسلم تہذیب اسی طرح چھائی ہوئی ہے، جس طرح بنگال پر ہندو تہذیب۔ زبان، ادب، معاشرت تمام چیزوں پر گہرا مسلم رنگ ہے اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یو۔پی کا کلچر ہندستان کے کلچر کا معیار ہے جس پر یو۔پی کے ہندو، مسلمان بجا طور پر فخر کرسکتے ہیں۔ علاوہ اس کے گذشتہ ایک ہزار سال کے تمام اسلامی آثار اور مقامات مقدسہ اسی صوبۂ یو۔پی، دہلی اور راجپوتانہ میں ہیں۔ اسلامی علوم و فنون کے تمام بڑے بڑے مراکز علی گڑھ یونیورسٹی، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، طبیہ کالج، ندوۃ العلماء، جامعہ دیوبند و سہارنپور، دار المصنفین وغیرہ وغیرہ ان ہی غیر اسلامی حلقوں میں ہیں۔ لیکن بُرا ہو فرقہ پروری کا جس سے مسلم لیگ کے بزرگ اس قدر مغلوب ہوگئے ہیں

---

[1] پنجابی صاحب "کانفڈریسی آف انڈیا" میں یہ بتلاتے ہوئے کہ یہ علٰحدگی کس طرح ہندوؤں کے تہذیب و تمدن کے احیا کیلئے بھی کس قدر مفید ہے۔ لکھتے ہیں ــــ "ہندو مسلمانوں کے مشترکہ فیڈریشن میں ہندو، اپنے خالصتاً ہندو صوبوں میں بھی، ہندو کلچر کے احیاء کا پروگرام جاری نہ کرسکیں گے۔" (صفحہ ۱۵۵)

کہ انھیں یہ حقیقت نظر نہیں آتی کہ وہ دلّی اور لکھنؤ کا عظیم الشان کلچر اور قابل فخر تاریخی آثار و مذہبی مقامات کو ایک شکست خوردہ فوج کی طرح ہندوؤں کے ہاتھوں میں سونپ کر پاکستان کے قلعے میں پناہ لینے جا رہے ہیں۔

اچھا اب آگے چلئے ـــــ مسلم لیگ ایک "اسلامی حکومت" قائم کرنے چلی تھی، اور اس کا نام ایک نہایت نفرت انگیز لفظ "پاکستان" رکھا گیا۔ جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ بقیہ ہندستان ناپاک ہے، لیکن ستم تو یہ ہے کہ اتنی بڑی قربانی کے بعد اسلامی حکومت کا خواب بھی منت کشِ تعبیر نہ ہوا۔ اس پاکستان میں ۴۱ فی صدی "ناپاک" بھی موجود ہیں، اور انھیں یا تو تمام کاروبارِ حکومت میں پورا پورا حق دیجئے یا ان سے جنگ کیجئے۔ ظاہر ہے کہ اس اقلیت کی موجودگی میں پاکستان کا دستور سوائے جمہوری کے کچھ ہو ہی نہیں سکتا، اور اسلامی حکومت قائم کرنے کا پھر کوئی امکان باقی نہیں رہ جاتا۔ پھر پاکستانی ریاستوں کا معاملہ ہے کوئی وجہ نہیں کہ کشمیر، کپورتھلہ وغیرہ کی ہندو اور سکھ ریاستیں برطانیہ کا سایہ چھوڑ کر "اسلامی پاکستان" کی ماتحتی قبول کریں۔ اگر ان کی شرکت ہو سکتی ہے تو کسی جمہوری نظام ہی میں ہو سکتی ہے۔ پھر پاکستان کے اندر (مسلم لیگ کی منظوری سے) گورنر جنرل، اور گورنروں کا موجود ہونا یہ بتا رہا ہے کہ یہ اسلامی حکومت کس "اسلامی" ٹائپ کی ہوگی۔

الغرض اسلامی حکومت کا منشا بھی پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ اب اس تصویر کا دوسرا رُخ ملاحظہ ہو۔ مسلم صوبوں کی اس علٰحدگی سے ہندوؤں کیلئے بھی کسی طرح کی آسانی پیدا نہیں ہوتی۔ اور انکا بھی کوئی مسئلہ حل نہ ہوا۔ ہندو۔ ہندستان میں بہر حال ۲ کروڑ مسلمان جو اسوقت موجود ہیں رہ ہی جاتے ہیں۔ یو۔ پی، بہار، مدراس، بمبئی، سی۔ پی۔ اڑیسہ، آسام غرضیکہ تمام ہندو صوبوں میں جو فی الحال ہندو مسلم سوالات ہیں، وہ بدستور قائم رہتے ہیں۔ زبان کا جھگڑا بجنسہٖ رہ جاتا ہے۔ ان صوبوں میں جتنی زبانیں اس وقت بولی جاتی ہیں، علٰحدگی کے بعد ان میں ایک بھی کم نہ ہوگی۔ گاؤ کشی، مسجد کے آگے باجا، امام باڑے، قبرستان، مساجد، و دیا مندر، واردھا اسکیم، ملازمت، غرضیکہ تمام کے تمام جھگڑے علیٰ حالہٖ قائم رہ ہی جاتے ہیں۔ اگر علٰحدگی سے یہ تمام جھگڑے مٹ جاتے تو ہندو بھی کہتے کہ ملک کے دو ٹکڑے تو ہو گئے لیکن چلو ان رات دن کے قضیوں اور خون خرابہ سے تو چھٹی ہوئی۔ لیکن اسکیم بنانے والے کا کمال ملاحظہ ہو کہ علٰحدگی بھی ہو جاتی ہے اور تمام کے تمام جھگڑے بھی بدستور قائم رہتے ہیں۔ یہ ہے مسلم لیگ کا کمال۔ حقیقت یہ ہے کہ فتنہ و فساد کی ایجاد و اشاعت میں پاکستانی بھائیوں نے اپنے گرد

انگریزوں کو بھی مات کر دیا ہے۔

اتنا ہی نہیں! اس اسکیم کا ایک اور بڑا کمال ہے — اور وہ یہ کہ ہندستان کی آزادی کا سوال بڑی خوبصورتی سے ہمیشہ کیلئے ملتوی ہو جاتا ہے۔ پاکستان کی کسی اسکیم میں بھی انگریزی اثر سے باہر ہونیکے جرم، کا ارتکاب نہیں کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا کہ پاکستانی اسکیم سے کسی کو فائدہ نہیں پہنچتا غلط ہے، اس تفرقہ انگیز اسکیم سے مستفید ہونے کیلئے برطانی شہنشاہیت موجود ہے جو گذشتہ دو سو سال سے ہمارے ہر افتراق سے فائدہ اُٹھاتی آئی ہے۔ یہی سبب ہے کہ واضعین اسکیم کو اس "پنجابی شاہکار" پر سب سے زیادہ داد انگلستان سے ملی۔

اگر غور کیجئے تو یہ اسکیم خود مسلمانوں کے حق بھی کسی طرح مفید نہیں۔ موجودہ صورتِ حال میں مسلمان جس پوزیشن میں ہیں۔ پاکستان ہو جانے پر وہ اس پوزیشن میں بھی نہیں رہتے۔ حقیقت یہ ہے کہ مشترکہ صورت میں مسلمان اُس سے کہیں زیادہ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جس کی پاکستان قائم کرنے کے بعد انھیں توقع ہے۔ مسلمان اس وقت ہندستان کے چار صوبوں کے سیاہ وسپید کے مالک ہیں۔ بلوچستان کو اصلاحات ملنے کے بعد پانچ صوبوں میں مسلم اقتدار قائم ہو جائے گا۔ ملک کے منجملہ ۱۱ صوبوں میں پانچ صوبوں کا مالک ہونا کوئی معمولی اقتدار نہیں ہے۔ اور وہ پانچ صوبے بھی کیسے ہیں؟ — جو اپنی پوزیشن کے سب بڑے اہم ہیں اور جس میں بنگال اور پنجاب جیسے عظیم الشان صوبے ہیں۔ پاکستان ہونے کے بعد بھی ہر حال وہ پانچ ہی صوبوں کے حاکم رہیں گے اور ان کے حیطۂ اقتدار میں ذرا بھی اضافہ نہ ہوگا بلکہ پاکستان کے سب سے بڑے صوبے یعنی بنگال اور پنجاب کے نصف حصے ان کے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ اسوقت ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو جو حقوق ملے ہوئے ہیں، وہ یقینی پاکستان کے قیام کے بعد باقی نہیں رہیں گے۔ سات ہندو صوبوں میں وزارت، اسمبلی، کانسل، پراونشل سول سروس، پولیس اور دوسری ملازمتوں اور ٹھیکے میں مسلمانوں کو آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ حقوق ملے ہوئے ہیں۔ ان صوبوں میں مسلمان کہیں ۱۴ فی صدی ہیں، کہیں دس فیصدی، کہیں سات فیصدی، کہیں ۴ فیصدی اور کسی جگہ صرف ایک فیصدی۔ لیکن ان صوبوں کے کاروبارِ حکومت میں مسلمانوں کو اپنے تناسب سے دو گونا اور سہ گونا حقوق حاصل ہیں، جو مشترکہ ہندستان میں تو یقینی حق بجانب ہیں، لیکن علٰحدگی کی صورت میں ان حقوق کو برقرار رکھنے کیلئے کوئی معقول بنیاد نہیں رہ جاتی۔ پھر حکومت ہند کے محکموں، جیسے جنگی، بندرگاہ، سنٹرل اکسائز، اسٹورس، پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف، ریڈیو، انکم ٹیکس، سکہ، نمک، افیون، رسل ورسائل، اور مختلف سرکاری ریلوے اور ورکشاپ میں جو لاکھوں مسلمان بڑی بڑی تنخواہوں پر ہندستانی ہونے کی حیثیت سے ملازم ہیں کیا انھیں یقینی استعفٰے دیکر پاکستان میں ملازمت

تلاش کرنی پڑیگی؟ پھر فوج کا محکمہ ہے، جو مرکزی محکموں میں مسلمانوں کی تعداد کے لحاظ سے سب سے زیادہ قابل غور ہے موجودہ ہندستانی فوج میں ۸۳ ہزار سپاہی، صرف پنجاب سے لئے گئے ہیں، جن میں اکثر مسلمان ہیں۔ جو سپاہی پنشن پلتے ہیں وہ ان کے علاوہ ہیں۔ غرضیکہ اس طرح تقریباً بتیس کرور روپیہ سالانہ اس مد سے مسلمانوں کو مل جاتا ہے۔ اور یقینی فوج میں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد ہندستانی ہونے کی وجہ سے ہے، جو تقسیم ہند کے بعد کبھی قائم نہیں رہ سکتی۔

یہ معاملہ یہیں تک نہیں رکتا۔ سرکاری ملازمتوں میں زیادہ سے زیادہ دو تین فیصدی مسلمان ہوں گے لیکن بقیہ ۹۷ فیصدی مسلمان تو اپنا نجی پیشہ کرتے ہیں۔ ان سات ہندو صوبوں میں لاکھوں مسلمان صنعت وحرفت، تجارت، دستکاری اور چھوٹے موٹے پیشے کرتے ہیں۔ کلکتہ اور بمبئی میں مسلمان بڑی سے بڑی تجارتی فرم کے مالک ہیں اور اربوں کی تجارت کرتے ہیں۔ پھر چھوٹے دوکانداروں اور پیشہ وروں کی تو کوئی حد نہیں، جن کے پیشے اور کاروبار کا دارومدار اپنے ہندو پڑوسیوں پر ہے۔ لیکن جب مسلمان بطور خود اپنی طرف سے ہندوؤں کو یہ سمجھنے پر مجبور کریں گے کہ مسلمان دوسری قوم ہیں اور چونکہ ان کا اصل وطن ("HOMELAND") پاکستان ہے، اسلئے یہ غیر ملکی بھی ہیں، تو کیا اس کا اثر ان مسلمانوں کی تجارت اور پیشے پر نہ پڑے گا؟

تاجر پیشہ اور سرکاری ملازم مسلمانوں کی جو حالت ہوگی وہ تو اپنی جگہ پر ہے، لیکن بقیہ ۹۰ فیصدی کاشتکار اور مزدور مسلمانوں کا حشر تو اس سے بھی زیادہ بھیانک نظر آتا ہے، کاشتکاری ایسی چیز ہے کہ اپنے پڑوسیوں کی مشارکت کے بغیر نہیں چل سکتی۔ اگر ہندو مہاجن قرض نہ دیں تو ایک گھڑی کھیتی باڑی کا کام نہیں چل سکتا۔ جو لوگ گاؤں میں رہتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ جس کسان کی اپنے پڑوسیوں سے بیر ہو اسکی کھیتی نہیں پنپتی۔ غرضیکہ روزانہ زندگی کے ایک سو ایک پہلو ایسے ہیں جن میں اگر ان غریب مسلمانوں کو اپنے ہندو پڑوسیوں کا اشتراک نصیب نہ ہو تو وہ ایک قدم نہیں چل سکتے۔ یہ بیچارے آخر کہاں جائیں گے۔ قائدِ اعظم، تو لکھ پتی ہیں انگلستان جاکر عیش وعشرت کی زندگی بسر کرسکتے ہیں۔ راجہ صاحب محمود آباد اور نواب صاحب چھتاری اپنی تعلقداری بیچکر سوئٹزرلینڈ کی سیر کرسکتے ہیں، لیکن ان بیچارے غریب پیشہ ور اور کاشتکار مسلمانوں کا کیا ہوگا۔

مشرقی ہندستان کے مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ وہ بھی ہے جو کلکتہ، بمبئی، احمد آباد، جھریا، جمشید پور اور کانپور وغیرہ کے کارخانوں اور کانوں میں کام کرتا ہے۔ اس طرح مزدور پیشہ مسلمانوں کی تعداد کم از کم دس لاکھ ہوتی ہے۔ یہ تمام ملیں زیادہ تر ہندوؤں کی ملکیت ہیں، جو اگر چاہیں تو مسلمانوں سے انتقام لے سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ پھر پچیس تیس لاکھ مسلمان اور بھی نکلیں گے جو اُن چھوٹے چھوٹے کاروبار، زمینداریاں اور دوکانوں میں ملازم ہیں جو ہندوؤں کی املاک ہیں۔ حامیانِ پاکستان نے یہ بتلانے کی زحمت گوارا نہ فرمائی کہ آخر ہندوستان کو ہندو اور مسلم ٹکڑوں میں تقسیم کرلینے کے بعد بیچارے ان غریب مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا۔

اور پاکستان کی 'اسلامی حکومت' اپنے اِن غریب بھائیوں کی کیا امداد کرے گی۔

ایک چیز اور بھی قابلِ غور ہے۔ یہ تو تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ہندوؤں میں مسلمانوں کے بہ نسبت تموّل زیادہ ہے اور نہ صرف ہندو صوبوں، بلکہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں بھی ٹیکس ادا کرنے والے (TAX-PAYER) زیادہ تر ہندو ہیں۔ اِن ہندو اکثریت کے صوبوں میں جو رقوم رفاہِ عام پر صرف کی جاتی ہے، اس میں کسی قسم کی فرقہ پروری نہیں برتی جاتی۔ اور مشترک صورت میں برتی بھی نہیں جاسکتی۔ مقصد یہ ہے کہ تعلیم، صحتِ عامّہ، وغیرہ ہر مد میں مسلمانوں پر ان کے حصہ رسدی سے (یعنی جتنا ٹیکس وہ ادا کرتے ہیں اس کے مقابلے میں) کہیں زیادہ رقم ——— صرف ہوتی ہے، علیحدگی کے بعد ہندو کہہ سکتے ہیں کہ مسلم بچوں کی تعلیم وغیرہ کا انتظام صرف مسلمانوں کے ادا کئے ہوئے ٹیکس سے کیا جائے، تو یقینی مسلمان اس بار کو برداشت نہ کر سکیں گے۔

لیکن مسلم لیگی اور پاکستانی بھائیوں کو اِن باتوں سے کیا مطلب، اِن کی تو وزارت مضبوط ہونی چاہئے اور بڑی بڑی ملازمتیں ملنی چاہئیں۔ خواہ اس کیلئے ۸ کروڑ مسلمانوں کا خون ہو جائے۔ مسلم اقلیتوں سے جو اُنھوں نے غداری کی وہ تو ہے ہی، لیکن انھوں نے پاکستان کے مسلم عوام کے حقوق بھی واضح نہیں کئے۔ اسلامی حکومت کے قیام کے بعد زمینداری، ساہوکاری اور سرمایہ داری بدستور رہے گی یا نہیں! پاکستانی حکومت اپنے ہر باشندے کیلئے روزگار مہیا کرنے کی ضامن ہوگی یا نہیں! قرضہ منسوخ کیا جائیگا یا نہیں۔ اِن سوالات کو قطعاً نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ وہ تو بس یہ کہہ دیتے ہیں کہ "اسلامی حکومت" ہوگی، جو عین سوشلزم ہے۔ اور اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ چونکہ ہر مسلمان کو ڈھائی روپے سیکڑہ سالانہ زکوٰۃ نکالنی پڑتی ہے، اس لئے سرمایہ داری کے بڑھنے کا امکان نہیں۔ آپ شاید یہ بھول گئے کہ اس وقت حکومت کو دس فیصدی انکم ٹیکس دینے کے بعد بھی سرمایہ داری زندہ ہے اور روبہ ترقی ہے۔

آخر پنجاب، سرحد، سندھ وغیرہ کے عام مسلمان اس تحریک کا کیوں ساتھ دیں، اس سے انکا کیا فائدہ ہوگا؟ —— پاکستانی حضرات کو یہ صاف صاف بتانا پڑیگا۔ صرف 'اسلامی حکومت' کہنے سے تو کام نہ چلے گا۔ انھیں صاف صاف بتلانا ہوگا کہ پاکستان کی حکومت سرمایہ دارانہ ہوگی یا اشتراکی (SOCIALIST)۔ یعنی پاکستان کے نظام میں مٹھی بھر زمینداروں اور سرمایہ داروں کا فائدہ ہوگا یا ۹۵ فیصدی غریب جنتا کا۔ دنیا میں اس وقت دو ہی نظامِ حکومت ہے، سرمایہ دارانہ اور اشتراکی۔ جمہوریت، نازیت، فیشزم، پارلیمنٹری حکومت، یہ تمام چیزیں، سرمایہ دارانہ نظام کا دوسرا نام ہیں۔ اِن دونوں کے درمیان کوئی تیسرا راستہ نہیں۔ موجودہ جنگ سے یہ چیز اور زیادہ صاف ہوتی جارہی ہے۔ دنیا ایک

دوراہے پر آگئی ہے یا تو اُسے سرمایہ دارانہ نظام قبول کرنا ہے یا اشتراکی۔ تمام ممالک یا تو فاسسٹ ہو جائیں گے، یا سرمایہ داری تباہ ہو جائیگی۔ اس وقت مزدوروں اور سرمایہ پرستوں میں جنگ ہے اور ہندستان میں بھی یہی دو طاقتیں کام کر رہی ہیں۔ اسلئے مسلم لیگ کو بھی صاف صاف بتلانا پڑے گا کہ وہ کس کے ساتھ ہیں۔ ہے۔

لیکن انھیں کیا غرض کہ وہ مسلمانوں کو یہ باتیں بتائیں۔ وہ جس گھوڑے پر سوار ہیں، اُسے اچھی طرح جانتے ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ مسلمانوں کیسے اپنے مذہب کا نام لینے کے بعد پھر کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ بیوقوف اسی نشے میں مست ہو جاتے ہیں، اور ہمارے حکم پر ناچنے لگتے ہیں۔ لیکن یہ مذہب کا نام آخر کب تک؟ ایک نہ ایک دن ان کا پول کھل کر رہے گا۔ دنیا میں ترقی کرنے والی قوتوں کی ہمیشہ مذہب کے نام پر مخالفت کی گئی ہے لیکن اسکے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مذہب کو اس طرح غلط طور پر پیش کرنے اور ترقی کا راستہ روکنے والوں کو ہمیشہ شکست نصیب ہوئی ہے۔ کیونکہ بقول شخصے کسی قوم کو ہمیشہ کیلئے دھوکے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ خود ترکی میں مصطفےٰ کمال پاشا کو ان رجعت پسند طاقتوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ اور انھیں دشمنِ اسلام، ملحد، دہریہ سب کچھ کہا گیا۔ اسی طرح ہر اُس ملک میں جہاں آزادی کی تحریکیں اُٹھی ہیں اور سیاسی انقلابات ہوئے ہیں۔ ان پیچھے کھینچنے والی طاقتوں نے ہمیشہ ان کا دامن پکڑا ہے۔ لیکن چونکہ یہ مذہب کے یہ جھوٹے نام لیوا عوام کی غربت اور فاقہ کشی کا مسئلہ حل نہیں کرتے، اور عوام کے جذبات کو اُبھار کر ظالم اور استحصالی طاقتوں کیلئے لوٹ کھسوٹ کا موقع فراہم کرتے ہیں، اسلئے ان میں وہ زور اور طاقت نہیں پیدا ہوتی جو ایک ملکی اور سیاسی جماعت میں ہوتی ہے۔

لہٰذا یہ جو ہمارے ملک میں آئے دن مذہب کے نام پر تحریکیں اُٹھ رہی ہیں۔ ان سے ہمیں گھبرانا نہ چاہیے اور ان کا ہمیں ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہے۔ یہ کوئی نئی چیز نہیں۔ ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ آزادی کی لڑائی کا ایک مورچہ یہ بھی ہے، اور اس پر بھی ہمیں جم کر لڑنا اور فتحیاب ہونا ہے۔ ان رجعت پسند طاقتوں کو بالآخر شکست ہو کے رہیگی۔ کچھ دنوں کیلئے وہ عوام کو دھوکہ دے سکتی ہیں، لیکن ان پیچھے چلنے والی قوتوں کا دنیا میں کوئی مستقبل نہیں، انھیں ہمیشہ شکست نصیب ہوئی ہے اور ہوتی رہے گی۔ خود ہندستان میں گذشتہ پچیس سال میں کتنی فرقہ پرور انجمنیں مذہب کی محافظت کے نام پر برساتی کیڑوں کی طرح پیدا ہوئیں اور بہت جلد فنا کی گود میں سو گئیں۔ ہندستان میں فرقہ پرست انجمنوں کی عمر پانچ سال سے زیادہ نہیں ہوتی۔ خلافت، شدھی، سنگھٹن، تبلیغ و تنظیم، مسلم کانفرنس، اتحاد ملت یہ تمام تحریکیں اپنے اپنے وقت میں زور و شور سے اُٹھیں اور دو چار سال کے اندر اس طرح مردہ ہو گئیں یہاں تک کہ آج سوائے ان کے بانیوں کے، ان کی کوئی یادگار باقی نہیں۔ ہندو سبھا اور مسلم لیگ بھی حقیقی معنوں میں دو چار برس

زندہ رہتی ہیں، اور اس کے بعد کسی کونے میں پڑی ہے جیسے نیم جاں سسکتی ہوئی اپنی دوبارہ زندگی کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ یہاں یہ چیز قابل غور ہے کہ جو فرقہ پرور جمعیتیں ترقی پسند تحریکوں کا ساتھ دیتی ہیں وہ زندہ رہتی ہیں مثال کے طور پر جمعیۃ العلماء ہند کو لیجیے، جو ایک فرقے اور گروہ کی انجمن ہونے کے باوجود آج بھی ایک زندہ اور فعّال جماعت ہے۔ اسی طرح جب تک خلافت نے ترقی پسند طاقتوں کا ساتھ دیا۔ وہ زندہ رہی، لیکن جیوں ہی اس نے رجعت پسندی کی طرف رُخ کیا۔ اس میں کوئی جان باقی نہ رہی۔

آخر یہ فرقہ پرور انجمنیں کیوں زندہ نہیں رہتیں؟۔ اس سوال کو سمجھنا بہت آسان ہے۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ان کا ملک اور جنتا کی اصل تکلیفوں اور سوالوں سے کوئی مطلب نہیں ہوتا، اور انھیں حل کرنے کیلئے وہ کوئی راستہ نہیں نکالتے، بلکہ ان کی راہ میں مزید الجھاوے پیدا کردیتی ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ رکاوٹیں ہی پیدا کرکے ہم زندہ رہ سکتے ہیں، حالانکہ رُکاوٹیں خواہ کتنی ہی طاقتور ہوں ان پر ایک نہ ایک دن قابو پالیا جاتا ہے۔ فرقہ پرست ادارے اپنی گرماگرمی کے لئے کبھی تبلیغ، و تنظیم، کبھی شدھی و سنگھٹن، اور کبھی مسجد شہید گنج اور منزل گاہ اور تبرّہ مدح صحابہ کے مسائل کھڑے کردیتی ہیں، لیکن ان اداروں کی عمر بھی اتنی ہی ہوتی ہے جتنی ان مسائل کی عمر ہوتی ہے، اور اس کے بعد قوم پھر اُسی جگہ آجاتی ہے جہاں سے چلی تھی وہ سیاسی حیثیت سے ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکتی اور یہی وجہ ہے کہ پچیس، تیس سال تک سیاسی جدوجہد میں حصّہ لینے کے بعد مسلمان آج پھر یہ سوچ رہے ہیں کہ "**مسلمان کیا کریں**"۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ فقرہ مسلمانوں کی گذشتہ تمام سیاسی پراگندگی اور بے راہ روی کا نچوڑ اور منطقی نتیجہ ہے۔ جس قوم نے ۱۹۴۷ء تک یہ طے نہ کیا ہو کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ اس کا خدا ہی حافظ ہے۔

مسلم لیگ کی موجودہ زندگی اور فعّالی کا سبب بھی یہی ہے کہ اُس نے مسجد شہید گنج اور منزل گاہ کی طرح "کانگریسی وزارتوں کے مظالم" کا ایک مسئلہ کھڑا کردیا اور بھولے بھالے مسلمانوں کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔ لیکن جب کانگریسی وزارتیں بطور خود ایک اہم ملکی سوال پر وزارت کو ٹھکرا کر الگ ہوگئیں تو انھوں نے "یوم نجات" منا کر اس مسئلے پر فاتحہ پڑھ لی اور کسی دوسرے مسئلے کی تاک میں لگے۔ وقت آگیا تھا کہ مسلم لیگ بھی کانگریسی وزارتوں کے ساتھ ساتھ مُردہ ہوجاتی، لیکن جیسے ہی مسلم لیگ سے مسلمانوں میں بددلی پیدا ہوتے دیکھی، اس کے ذہین اور بیدار مغز قائد اعظم نے پاکستان کا معاملہ

کھڑا کر دیا۔ لیکن پاکستان کی تجویز پاس کرنے کے بعد مسلم لیگ خود اس نہج پر آ گئی ہے کہ اس کے لئے سوائے تباہی کے اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا ہے۔ وہ یا تو مسلمانوں کو پاکستان دلوائے، یا پھر اس سے پیچھے ہٹ کر کانگریس سے تصفیہ کرے۔ اوّل الذکر صورت ناممکن ہے، اور مؤخر الذکر صورت میں مسلم لیگ کی موت ہے۔ بہر حال یہ امر تو اب مسلّم ہی ہے کہ جب تک پاکستان نہیں ہوتا۔ مسلم اقلیتوں کی حفاظت بھی نہیں ہو سکتی۔ مسلم اقلیتیں مسلم لیگ سے اپنی محافظت کی طالب ہوں گی اور وہ کہے گی کہ "پاکستان" بن جانے دو۔ غرضیکہ وہی مثل ہوئی کہ نہ رادھے کو نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچیں گی۔

لیکن اس سیاسی گمراہی میں صرف فرقہ پرور لیڈروں ہی کا قصور نہیں، بلکہ مسلم عوام بھی ایک بڑی حد تک اس کے ذمہ دار ہیں جو یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ مذہب کا نعرہ لگانے سے ان کی زندگی کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ قدرتی طور پر ملک کے اہم مسائل جیسے غربت، بے روزگاری، بیماری، جہالت، سیلاب وغیرہ دوسرے فرقوں کی طرح مسلمانوں پر بھی اثر انداز ہوتے اور ان کو بے چین کرتے ہیں۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ اس کے حل کرنے کی جدوجہد کریں، وہ اس کا علاج فرقہ پرستی میں ڈھونڈھنے لگتے ہیں۔ اور اس طرح عمل سے گریز کرتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی پریشانی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ دنیا عالم اسباب ہے۔ اور اس حقیقت کو اسلام نے بھی تسلیم کیا ہے۔ اگر ایک شخص کو روٹی کی ضرورت ہے تو اللہ اکبر کا نعرہ لگانے سے اس کی بھوک نہیں مٹ سکتی۔ اسے آٹا فراہم کرنا، آگ جلانا، اور روٹی سینکنا ہی پڑے گا۔ مسلمانوں کی موجودہ پریشانی کا سبب وہی ہے جو اس ملک کے دوسرے فرقوں کی پریشانی کا باعث ہے۔ یعنی ایک استحصالی اور لوٹنے کھسوٹنے والے سامراج کی غلامی۔ ہمارے افلاس و نکبت کا سوال، ہندو مسلم قطعاً نہیں۔ اگر سارے ہندستانی مسلمان ہوتے اور اسی طرح انگریز ہم پر مسلط ہوتے تو بھی ہمارے مسائل بعینہ یہی ہوتے جو آج ہیں۔ ہمیں ٹھنڈے دل سے اِن مسائل پر غور کرنا ہے اور ان کے لئے وہی وسائل اختیار کرنا ہے جو ان مسائل کے حل کے لئے دنیا میں اختیار کئے جاتے ہیں۔ اللہ اکبر کا نعرہ لگانے سے یقینی یہ مسائل حل نہ ہوں گے۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اعدائے اسلام کو غزوات میں ایک نعرے سے یا دعا کر کے نہیں شکست دی۔ بلکہ اس کے لئے وہی اسباب اختیار کئے جو دنیا کرتی ہے۔ یعنی سپاہی اکٹھا کر کے فوج ترتیب دی اور اسے ہتھیاروں سے مسلح کیا۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے لئے یہ دور بہت نازک آ گیا ہے۔ لیکن اس بے چینی اور

گھبراہٹ میں کوئی ایسی حرکت نہ کرنا چاہئیے جو اس نزاکت میں مزید اضافہ کردے۔ بلکہ ٹھنڈے دل سے اِسے سوچ سمجھ کر حل کرنا ہے۔ دنیا کی ہر قوم کی زندگی میں آئے دن ایسے دَور آتے ہیں، لیکن وہ پامردی اور عزم واستقامت سے ان کا مقابلہ کرتی ہیں۔ اس طرح گھبرا کر ایک ناممکن العمل تجویز پیش کردینا تدبیر کا فقدان اور سیاست کا دیوالیہ ہے۔ مسلمانوں کی اسی سیاسی سراسیمگی کا نتیجہ تحریک تھی جو ہندستان سے ہجرت کیلئے اُٹھائی گئی تھی۔ لیکن بجائے اس کے کہ اس سے مسلمانوں کا مسئلہ حل ہوتا، ہجرت کرنے والے ہزاروں مسلمان خاندان تباہ وبرباد ہوگئے۔ تحریکِ پاکستان کی بنیاد بھی وہی پریشانی وسراسیمگی، غصہ اور ضد ہے، جو تحریک ہجرت کی بنیاد تھی۔ اور اس کا بھی وہی نتیجہ نکلنے والا ہے، جو اُس تحریک کا ہوا۔ اسی طرح کی ایک تحریک یورپ میں "تقسیم بلقان" کی اُٹھی تھی۔ بلقان تقسیم ہوگیا۔ لیکن آج ان بلقانی ریاستوں کا جو حال ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔

دنیا میں چھوٹے ملکوں کا کوئی مستقبل نہیں ——— اس حقیقت کو موجودہ جنگِ عظیم نے ایک مسلمہ کی حیثیت دیدی ہے۔ سائنس نے انسان کی تخریبی قوتوں کو اس قدر بڑھا دیا ہے کہ چھوٹی قوموں کیلئے زندگی محال ہوگئی ہے۔ چھوٹے ملکوں کی بیس۲۰ سال کی تیاریاں بھی اسے کسی بڑی طاقت کے سامنے ایک ہفتہ بھی صف آرا نہیں رکھ سکتیں۔ موجودہ جنگ سپاہیوں کی نہیں بلکہ سامانِ حرب کی جنگ ہے۔ اس میں وہی قومیں کامیاب ہوسکتی ہیں جن کے پاس افراط سامانِ حرب ہو۔ اور ظاہر ہے کہ جدید قیمتی آلاتِ حرب بڑی تعداد میں مہیا کرنا کسی چھوٹے ملک کے بس کی بات نہیں۔ یہ کام بڑی بڑی وحدتیں (UNITS) ہی کرسکتی ہیں۔ نہ صرف یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے ممالک کا زندہ رہنا محال ہے، بلکہ اب تک جو طاقتیں دنیا میں بڑی طاقتیں مانی جاتی تھیں ان کے بھی چھکے چھوٹے ہوئے ہیں۔ فرانس جیسا بہادر اور طاقتور ملک آج نازی استبداد کے نیچے کراہ رہا ہے۔ تین ہفتے میں دنیا کی اتنی بڑی جمہوریت خاک میں مل گئی۔ حکومت برطانیہ بھی، جس کا سامراج دنیا کی ایک تہائی میں پھیلا ہوا ہے۔ آج نازی طاقتوں سے زندگی وموت کی جدوجہد میں صف آرا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب چھوٹے ممالک کا کیا ذکر، بڑی بڑی طاقتوں کیلئے بھی تا وقتیکہ وہ اپنے کو اور زیادہ مضبوط نہ کرلیں زندہ رہنا مشکل ہے۔ اگر اس قسم کی بڑی بڑی دو۲، دو۲، تین، تین طاقتیں مل کر ایک ہو جائیں تب ہی وہ زندہ رہ سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں سیاسیین برطانیہ کی وہ کوشش جو انگو

نے حال میں فرانس اور انگلستان کو ایک ملک بنا دینے کی قرارداد پیش کی تھی، بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ برطانیہ کی یہ تجویز ۱۶؍ جون ۱۹۴۰ء کو فرانسیسی حکومت کے سامنے پیش بھی کر دی گئی تھی، اور اگر اس کے فوراً ہی بعد فرانس کو شکست نہ ہو جاتی تو یقینی یہ بروئے کار آ جاتی۔ اس قرارداد میں یہ امر تسلیم کئے گئے ہیں کہ فرانس اور گریٹ بریٹن ایک ملک قرار دیئے جائیں، انگلستان کے باشندوں کو فرانس کے تمام شہری حقوق حاصل ہوں اور اسی طرح ہر فرانسیسی کو انگلستان کا شہری سمجھا جائے۔ دونوں ممالک کی ایک پارلیمنٹ ہو، اور ایک ہی کابینہ وزارت ہو۔ اسی قسم کی ایک کوشش امریکہ اور گریٹ بریٹین کو ایک کرنے کیلئے بھی ان دنوں جاری ہے۔ غرضیکہ اب یہ چیز تسلیم کی جا چکی ہے کہ موجودہ جنگ کے بعد روس، امریکہ، برطانیہ، جرمنی اور جاپان کے سوا دوسرے ملکوں کا آزاد حیثیت سے زندہ رہنا قطعاً محال ہے رومانیہ، بلغاریہ، یونان، یوگوسلاویہ، ٹرکی، سویڈن، عرب، ایران، افغانستان، اور اس قسم کے دوسرے چھوٹے ممالک کی زندگی پانچ دس سال سے زیادہ نہیں۔ انھیں کسی نہ کسی بڑی وحدت میں مل جانا پڑے گا۔ ہاں اگر ہندستان آزاد ہو جائے تو وہ بہت جلد بڑی طاقتوں کی صف میں جگہ لے سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے پاس اپنے خود اتنے بے پناہ وسائل ہیں کہ آزادی حاصل ہونے پر یہ دنیا کی اوّل درجے کی طاقت ہوگی۔

لیکن ایک ایسے نازک وقت میں جبکہ دنیا اس نہج پر آ گئی ہے اور ایک عالمگیر اشتراک کی طرف بڑھ رہی ہے، مسلم لیگی حضرات کا 'پاکستان' کی ڈفلی بجانا نہ صرف بے محل ہے بلکہ پرلے سرے کی حماقت ہے۔ اگر ہم یہ بھی تسلیم کر لیں کہ ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں اور ہندستان اور پنجاب دو ملک ہیں، تو بھی ہم اس وقت ایسے نازک دور میں آ گئے ہیں کہ اگر ہمیں صفحۂ ہستی پر قائم رہنا ہے تو ہمیں ان دونوں کو ملا کر ایک قوم بنانا ہے اور ایک ملک تسلیم کر لینا ہے۔ ورنہ دونوں کی تباہی ہے۔ اگر خیوا، سمرقند، تاشقند، بخارا وغیرہ کے مسلمان اپنی محافظت اور خوشحالی کے لئے روس کے ساتھ مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں تو ہم ہندوؤں سے بھی یقینی مل سکتے ہیں۔ بلکہ اب تو حالات اس رخ پر رہے ہیں کہ چین اور ہندستان کو مل کر ایک ملک اور ایک قوم ہو جانا چاہئے۔ نہ کہ ہم اپنے موجودہ اتحاد کو بھی کھو بیٹھیں۔ وہ دن قریب آ رہا ہے کہ ایران اور افغانستان کی زندگی محال ہو جائے گی اور انھیں یا تو ہندستان کے ساتھ شامل ہو جانا پڑے گا۔ یا روس کے ساتھ۔

حضرت پنجابی صاحب نے ایک جگہ ارشاد فرمایا ہے کہ آزادی، مسلمانوں کیلئے وہ معنی نہیں رکھتی جو کانگریس کیلئے رکھتی ہے۔ کانگریس کو آزادی کی اسلئے ضرورت ہے کہ وہ اپنی قوم کیلئے وہ تمام سوشل اور اقتصادی و معاشی فائدہ اُٹھانا چاہتی ہے، جو آزادی سے ممکن ہے۔ لیکن مسلمانوں کیلئے یہ مذہبی ضرورت ہے (صفحہ ۹۸) یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان قوم ایک بڑی خوشحال قوم ہے، اور اسے سوائے مذہبی آزادی کے کوئی چیز درکار نہیں۔ حالانکہ مسلمانوں کی اقتصادی اور معاشی حالت کہیں زیادہ ابتر ہے۔ مسلمانوں میں افلاس، تباہ حالی، فاقہ کشی، بیروزگاری اس درجہ ہے کہ ناقابل بیان ہے۔ خاص کر مسلمانوں کا متوسط طبقہ جس سرعت کے ساتھ فنا ہو رہا ہے، اسے دیکھکر رونا آتا ہے۔ کسی قوم کے کلچر کا حامل اس کا متوسط طبقہ ہی ہوتا ہے۔ لہذا یہ طبقہ اپنے ساتھ ہمارے بہترین کلچر کو بھی لیکر ڈوب رہا ہے۔ مسلمان قوم کس طرح زوال پذیر ہوتی جا رہی ہے یہ اس امر سے ظاہر ہے کہ ہندستان کے تمام مخش پیشوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اور اس میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ اسی طرح آپکو گداگر بھی زیادہ تر مسلمانوں ہی میں نظر آئیں گے۔ بیچارے عام مسلمانوں کا کیا ذکر۔ کسان مزدور، اور پیشہ ور مسلمانوں کے افلاس کا تو یہ حال ہے کہ کوئی حساس انسان اسے دیکھ نہیں سکتا۔ اس بے پناہ افلاس کا سب سے زیادہ اثر مسلمانوں کے اخلاق پر پڑ رہا ہے۔ اور جو قوم اس قدر بلند اخلاق کی مالک تھی آج اُس کی اخلاقی حالت پر رونا آتا ہے۔

لیکن ان فرقہ پروروں کیلئے یہ چیزیں قابل توجہ نہیں۔ انھیں تو آزادی صرف مذہبی اصلاحات کیلئے چاہئے۔ لیکن شاید انھیں یہ معلوم نہیں کہ آج دنیا میں آزادی کا صرف ایک مطلب ہے یعنی ---- قومی خوشحالی و ترقی۔ روس نے اسی کیلئے آزادی کی لڑائی لڑی، ٹرکی نے اسی کی خاطر جد وجہد کی، چین نے اسی مقصد کیلئے جان کی بازی لگادی ہے۔ دنیا میں آزادی کا اس کے سوا دوسرا کوئی مفہوم نہیں۔ فلسطین کے عرب مذہب کیلئے نہیں بلکہ اپنی سیاسی اور اقتصادی غلامی کے خلاف انگریزوں اور یہودیوں سے برسر پیکار ہیں۔ دنیا میں سیاسی اور اقتصادی آزادی ہی کے بعد مذہب بھی مضبوط ہوتا اور آگے بڑھتا ہے۔ ہندستان کے ۳۵ کروڑ انسانوں کے روٹی کا سوال حل کرنا ہندستان کا اس وقت سب سے بڑا مقصد ہے۔ اس کے آگے کسی مقصد کو اوّلیت نہیں دی جا سکتی۔ یہ ہماری پہلی قومی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے اس بھوک، افلاس، بیروزگاری، جہالت اور بیماری کو دور کرنا ہے ---- اور یقینی یہ تمام چیزیں وطن عزیز کی آزادی پر منحصر ہیں۔ آزادی اور خوشحالی کے بعد ہی مذہب بھی پنپ سکتا ہے۔ آزادی ہمارے تمام مذہبی جھگڑوں کا بھی خاتمہ کر دے گی۔

کیونکہ یہ تمام جھگڑے دراصل روٹی کے لئے ہیں۔ شہنشاہیت اور پونجی پتی یہ جھگڑے اپنے بچاؤ کیلئے پیدا کرتے ہیں۔ دو چار سیٹ اِدھر اُدھر ہونے یا کچھ لوگوں کو وزارت اور ملازمت مل جانے سے اسلام سر بلند نہیں ہو سکتا۔ اسلام جب ہی سر بلند ہوگا جب ہندستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کے گھروں میں فاقہ مستی کے بدلے خوشحالی اور فرخندہ حالی کا دور دورہ ہوگا۔ لہٰذا مسلمانوں کو سب سے پہلے آزادیٔ وطن کی جدوجہد کرنا چاہیئے جس کی سب سے زیادہ مسلمانوں کو ضرورت ہے۔

ہندستان میں ایک عرصے سے آزادی کی جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ اور اس میں دن بدن ملک کے استحصال شدہ (EXPLOITED) طبقے جیسے کسان اور مزدور، کثرت سے شریک ہوتے جا رہے ہیں، اور اس جنگ کو زیادہ سے زیادہ انقلابی شکل دیتے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں میں بھی ۹۰ فیصدی کسان اور مزدور ہی ہیں، مسٹر جینا، راجہ صاحب محمود آباد اور سر عبداللہ ہارون جیسے شاید ایک فیصدی بھی نہیں۔ مسلمان بہت زیادہ تباہ حال ہیں۔ اس لئے انکا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ کسانوں اور مزدوروں کی تحریک کو مضبوط کریں اور پھر تمام ملک کے ایک متحدہ سامراج دشمن مورچے میں صف آرا ہو جائیں تاکہ یہ جنگ زیادہ سے زیادہ انقلابی شکل اختیار کرے اور تمام سیاسی طاقت ملک کے عوام کے ہاتھوں میں آجائے۔ مسلمانوں کیلئے اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

ہاں یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کو اپنے تمام جائز حقوق کی محافظت کا پورے شدومد سے مطالبہ کرنا چاہیئے۔ وہ آزادی ہرگز آزادی کہے جانے کے لائق نہیں جو ملک کے کسی فرقے کے حقوق کو کچلتی ہو۔ مسلمانوں کو اپنے تمام مذہبی، کلچرل اور لسانی آزادی کا بجا طور پر مطالبہ کرنا چاہیئے، اور اس سے ایک انچ پیچھے نہ ہٹنا چاہیئے۔ انھیں اعلان کر دینا چاہیئے کہ وہ اُسی آزادی کے حق میں ہو سکتے ہیں، جس میں مکمل مذہبی آزادی ہو، جہاں ہر مذہب و ملت کے پیرو کیلئے یکساں حقوق اور مواقع ہوں۔ جہاں مسلمانوں کے کلچرل خصوصیات محفوظ رہ سکیں۔ جہاں مسلمانوں کا پرسنل لا، شریعت اسلامیہ کے مطابق جاری ہو، جہاں مسلمانوں کو تمام مذہبی رسومات ادا کرنے (بشمول قربانی) کا پورا حق ہو، جہاں تمام مساجد، خانقاہیں، امام باڑے، قبرستان اور دوسرے مذہبی مقامات اسٹیٹ کے قبضے سے باہر ہوں، وغیرہ وغیرہ۔ ساتھ ہی ساتھ زبان کے مسئلے پر بھی پورا زور دینا چاہیئے، اور یہ مطالبہ کرنا چاہیئے کہ آزاد ہندستان کی قومی زبان وہی ہو

جو اس وقت شمالی ہندستان میں عام طور پر بولی جاتی ہے۔

اِن کے علاوہ مسلمانوں کا سب سے بڑا سیاسی مطالبہ یہ ہونا چاہئے کہ آزاد ہندستان کی حکومت تمام باشندگانِ ہند کیلئے روزگار مہیا کرنے، تمام استحصالی اداروں کا خاتمہ، قرضوں کی منسوخی، مزدوروں کو معقول اُجرت ملنے، کسانوں پر لگان نہ لگنے، بچوں کی پرورش اور تعلیم مفت دینے، تمام بیماروں کا مفت علاج کرنے، اور ضعیفوں اور اپاہجوں کو پنشن دینے کا ذمہ لے۔ اس کے ساتھ ساتھ صوبوں میں زیادہ سے زیادہ خود مختاری تفویض کئے جانے کا مطالبہ کرنا چاہئے، اور مرکز کے ہاتھ میں صرف وہی صیغے ہوں جنھیں رکھنا بہت زیادہ ضروری ہو۔ کسی مخصوص فرقے کے لئے اُس وقت تک اسمبلی میں کوئی قانون نہ بنایا جائے، جب تک اس فرقے کے ممبروں کی ایک بڑی اکثریت اس کی حمایت نہ کرے وغیرہ وغیرہ۔

اِن مطالبات اور عزائم کے ساتھ مسلمانوں کو آگے بڑھنے والی قوتوں کے ساتھ جنگِ آزادی میں کود کر اپنی روایتی شجاعت اور بہادری سے وطن کو آزاد کرانا چاہئے، اور اس طرح ابنائے وطن کیلئے ایک رحمت بن جانا چاہئے۔ اسی صورت میں ہندستان اور اسلام دونوں سربلند ہو سکتا ہے۔

مندرجہ بالا نہج پر آزادی ملنے کے بعد جب ہندستان کے پانچ اہم صوبوں پر مسلمانوں کا اقتدار ہو، اور بقیہ سات صوبوں میں وہ ایک باعزت پوزیشن کے مالک ہوں گے۔ اور مرکزی اسمبلی کی ایک تہائی نشستیں ان کے قبضے میں ہوں گی، تو یقینی مسلمان ایک ایسی پوزیشن کے مالک ہوں گے جو قابلِ رشک ہوگی۔

یہی ہیں مسلمانوں کے جائز اور واجب مطالبات۔ اِسی پر مسلمانوں کو زور دینا چاہئے۔ اور اگر اِس سے زیادہ کے لئے مطالبہ کیا گیا تو یہ اس ملک میں ہماری تعداد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نہ صرف ناانصافی پر مبنی ہوگا، بلکہ اسلامی حق پرستی اور معقول پسندی کے منافی ہوگا۔

تمام شد